شیخ عبدالقادر حیات و خدمات

مصنف

شیخ محمد نصیر ہمایوں

قومی کتب خانہ لاہور

شیخ عبدالقادر حیات وخدمات

مصنف

شیخ محمد نصیر ہمایوں

قومی کتب خانہ لاہور

فہرس

دیباچہ

سرعبدالقادر مرحوم جب زندہ تھے تو کوئی ملّی انجمن اور کوئی ادبی مجلس ایسی نہ تھی جو اُن کی سرپرستی کو اپنے لئے قابلِ عزت نہ سمجھتی ہو۔

ہر ادبی اجتماع کا اہتمام فرمانے والے حضرات کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ ان کے اجتماعات کی صدارت سرعبدالقادر فرمائیں۔

لیکن یہ کتنی نا احسان شناسی کی بات ہے کہ سرعبدالقادر جب اِس دُنیا سے رخصت ہو گئے تو نہ کسی ملّی انجمن نے اور نہ کسی ادبی مجلس نے ہندوستان و پاکستان کی اس عظیم و جلیل شخصیت پر اُن کے شایانِ شان سوانح مرتّب کی، حتیٰ کہ سرعبدالقادر مرحوم کی مجلسی زندگی کی کوئی قابلِ قدر رُوداد تک شائع نہیں کی۔

حالانکہ سرعبدالقادر ایسے بزرگوں کی سیرت نئی نسلوں کے لئے اپنے اندر بڑے سبق رکھتی ہے۔ وُہ اُن شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کی عمارت خود تعمیر کی تھی۔

میرے نزدیک اس کتاب کے مؤلف و مرتّب جناب محمد نصیر ہمایوں قابلِ صد ستائش ہیں کہ انہوں نے سرعبدالقادر کی سیرت پر یہ جامع مانع اور ہر لحاظ سے وقیع کتاب مرتّب کر کے سرعبدالقادر کی مثالی زندگی نئی نسلوں کے سامنے پیش کی ہے۔

جناب محمد نصیر ہمایوں کی اپنی زندگی سر عبدالقادر سے بہت ملتی جلتی ہے۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی کی عمارت خود تعمیر کی ہے اور نہ صرف قومی کتب خانہ، احسن برادرز اور تعمیر روزنامہ ایسا ادبی اداروں کو قائم کیا ہے، اُردو زبان کے سرمایہ میں کئی بیش بہا اضافے کئے ہیں۔

وہ تحریک آزادی سے لے کر تحریک پاکستان تک ایک اَن تھک سپاہی کی حیثیت سے بڑی خاموشی کے ساتھ دن رات کام کرتے رہے ہیں اور اس مُلک کی وہی خدمت انجام دی ہے جو کوئی بڑی سیاسی مجلس انجام دیتی۔

اُن کی پیشِ نظر کتاب فنِ سیرت کے لحاظ سے ایک بہت کامیاب تصنیف ہے۔ انہوں نے اپنی اس تالیف میں نہ صرف آداب سیرت نگاری کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ سر عبدالقادر مرحوم کے خیال و فکر اور کردار پر گفتگو کرتے وقت مرحوم کی تحریر سے بہت قیمتی اور موزوں اقتباسات پیش کر کے اپنی کتاب کے حُسن و خوب صورتی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مجھے اس کتاب کا مسودہ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی اور میں نے ہمایوں صاحب سے درخواست کی، اس کا پیش لفظ لکھنے کی عزت مجھے دیں۔

رشید اختر ندوی

تمہید

(شیخ سر عبدالقادر مرحوم قصور کے رہنے والے تھے۔ وہ ۱۸۷۴ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ جہاں اُن کے والد شیخ فتح الدین محکمۂ مال میں مُلازم تھے۔ شیخ عبدالقادر مرحوم ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو تین سو سال سے علم دوستی کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے سرکاری ملازمتوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

اُنھوں نے ابتدائی تعلیم قصور میں حاصل کی۔ فارسی کی تعلیم اُنھوں نے اپنے والد سے حاصل کی ۱۸۹۴ء میں فورمن کرسچین کالج لاہور سے فرسٹ

ڈویژن میں بی۔اے پاس کیا۔ کالج کی تعلیم کے دوران ہی ادبیات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد وہ کچھ عرصہ منٹگمری میں اسکول ٹیچر لگے رہے ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اُردو کا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا۔ ۱۹۰۴ء میں وہ بیرسٹری کے لئے لندن چلے گئے۔ جہاں سے وہ اپنا کورس مکمل کر کے ۱۹۰۷ء میں وطن تشریف لے آئے۔ پہلے پہل دہلی میں کام شروع کیا۔ پھر لاہور چلے آئے چار برس بعد لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہو گئے۔ سرکاری کام کے ساتھ ساتھ آپ تعلیمی معاملات میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ اور اپنی کوشش سے تین نئے ہائی اسکول جاری کرائے۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے ۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب

ہوئے۔ اور ۱۹۲۵ء میں وزیرِ تعلیم بنے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے مجلسِ اقوام کے جلسہ میں شریک ہونے کے لئے جنیوا تشریف لے گئے۔ جنیوا سے واپسی پر آپ دوبارہ ہائی کورٹ کے جج بنے۔ اور اس کے بعد وائسرائے کی کونسل میں لاء ممبر رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد پانچ سال کے لئے ولایت میں انڈیا کونسل کے ایڈوائزر بھی رہے۔

سوشل خدمات :۔

شیخ صاحب کو بہت سی انجمنوں اور اداروں کی صدارت کے لئے منتخب کیا جاتا رہا۔ پچیس برس تک پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے ممبر و فیلو رہے۔ اور بڑے دبدبے کے ساتھ کام کیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی صدارت بھی کافی مدت آپ ہی کے سپرد رہی اور آپ ہر ممکن

طریقے سے اِس مفید ادارے کی خدمات بجا لائے
اِسی طرح مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ کالج
آپ کی توجہ سے فائدہ اُٹھاتے رہے۔

اُردو سے بے پناہ لگاؤ:-

۱ شیخ صاحب کو اُردو سے لگاؤ ابتدا ہی سے
تھا۔ جس زمانے میں کالج میں پڑھتے تھے آپ
نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا عنوان
تھا۔ "اُنیسویں صدی کا اُردو ادب" اور بلحاظِ
موضوع یہ کتاب آج بھی یکتا اور مفید ہے۔
اِسی طرح ابتدائے شباب میں ہی آپ نے ایک
ادبی مجلس کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد اُردو زبان
کو ترقی دینا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں رسالہ "مخزن"
کا اجراء اِس مقصد کے حصُول کا زینہ بنا۔

"مخزن" میں لکھنے والے مولانا شبلی رح، مولانا
حبیب الرحمٰن خان شیروانی، سیّد سجاد حیدر یلدرم اور

اکبر الہ آبادی جیسے پائے کے لوگ تھے۔ یہ رسالہ "مخزن" کے معیار اور سر عبدالقادر کی ذاتی کوششوں ہی کا اثر تھا کہ لوگوں کو احساس ہُوا کہ اُردو میں بھی ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی پُوری پُوری صلاحیت موجود ہے۔ یہاں تک کہ اب لوگ اُردو میں لکھنے پڑھنے اور فنِ شاعری کو باعثِ فخر سمجھنے لگے۔ اور ایسا شوق پیدا ہو گیا کہ غالب اور میر کے تذکرے پھر تازہ ہوئے، باقاعدہ علمی اور ادبی محفلیں منعقد ہونے لگیں اور انگریزی کتابوں کے ترجمے کثرت سے ہوئے۔

بڑے بڑے سرکاری عہدے اور ذمّہ داریاں سنبھالنے کے باوجود شیخ صاحب مرحوم کا ذوق و شوق اور اُردو سے لگاؤ کبھی کم نہیں ہُوا۔ چنانچہ جس زمانے میں لندن میں وزیر ہند کے مشیر تھے، وہاں بھی ہندوستانی سپیکنگ یونین کے نام سے ایک

اِدارہ قائم کیا۔ اور ہندوستانی طلباء کو ہر ممکن موقعے پر اس کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

اِن کے مضامین سادگی کے ساتھ نہایت دلچسپ ہیں۔ اور اِن میں زیادہ تعداد تنقیدی مضامین اور مقدمات کی ہے۔ شیخ عبدالقادر نے اپنی شخصیت اور خلوصِ عزم کی بنا پر بہت سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے حوصلے بڑھائے اور اُن کے کلام و تحریر کے محاسن بیان کر کے اُنہیں شائقینِ ادب سے متعارف کرایا۔ چنانچہ اِس صدی کی ابتداء میں شمالی ہند میں جتنی کتابیں شائع ہوئیں اُن میں کئی کُتب کے مقدمات شیخ صاحب مرحوم کے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ اِس کے علاوہ اُن کی خدمات کے ایسے پہلو بھی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ مثلاً کتابیں چھاپنے کے متعلق رہنمائی، کتابت وغیرہ کے بارے میں مشورے

نیز ادیبوں کی آپس کی رقابت کے جھگڑے مٹانے کی زحمت بھی اُٹھاتے رہے۔

سیاسی نظریہ:-

شیخ صاحب بڑے پختہ عقائد اور منجھے ہوئے دماغ کے آدمی تھے۔ سیاست میں وہ سرسیدؒ مرحوم کی پالیسی کے ہمنوا تھے اور مولانا ظفر علی خان یا مولانا ابوالکلام آزاد کی ہنگامہ آرائیوں کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے زمانے میں علی برادران' علی گڑھ یونیورسٹی کے علی الرغم جامعہ ملیہ قائم کرنے کے بعد لاہور آکر اسلامیہ کالج بند کرا کے ایک اور ادارہ قائم کرانا چاہتے تھے۔ تو اُن کے اقتدار اور ہردلعزیزی کے باوجود یہ شیخ صاحب مرحوم ہی کا حوصلہ تھا کہ بھرے مجمعے میں کہہ دیا کہ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کالج توڑ دیا جائے۔ اگر چاہتے ہو تو اپنی خواہش کا کوئی اور کالج

بنا لو۔ لیکن یہ کالج اِسی طرح رہے گا۔" اور اِس بات پر ایسے ڈٹے کہ علی برادران کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رقابت اور رُوٹھ مناؤ عام سی بات ہے۔ خصوصاً کلبوں اور انجمنوں میں اِس بناء پر پارٹی بازیاں رہتی ہیں اور عموماً فریقِ مخالف کے راستوں میں رُکاوٹیں پیدا کرنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ ایک ایسے ہی موقع پر جہاں جذبات میں سخت ہیجان تھا، ایک جلسہ برکت علی محمڈن ہال (لاہور) میں منعقد ہوُا۔ خطرہ تھا کہ محفل برہم ہو جائے گی مگر شیخ صاحب مرحوم کمالِ اطمینان سے اُٹھے اور مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

"مَیں بھی جھوٹا مرے وعدے بھی سراسر جھوٹے
تم ہی سچے سہی اِس بات کا جھگڑا کیا ہے؟"

بس پھر کیا تھا، لوگوں کا مزاج بدل گیا۔ دلوں کی گرہ کھُل گئی اور پارٹی بازی ختم ہو گئی۔

اہلِ علم کا احترام

آپ کے دِل میں عُلماء اور ادیبوں کا احترام قرار واقعی تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔کہ "علی گڑھ کے نورتنوں میں حالی اور شبلی بھی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔میں نے اُن دونوں کو دیکھا۔دونوں سے میری خط وکتابت رہی۔دونوں سے بارہا باتیں کیں۔اُن سے پڑھا نہیں مگر آرزو رہی کہ کچھ دِنوں اُن کی شاگردی کی ہوتی۔اُن لوگوں پر ہمیشہ رشک رہا جنہیں اُن سے کچھ پڑھنے کا موقع ملا"۔ اُس زمانے کے بزرگوں کے بارے میں شیخ صاحب کی بے لاگ رائے قابلِ مطالعہ ہے۔مثلاً حالی اور شبلی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:۔

"دونوں کا رنگ ایک دُوسرے سے جُدا تھا۔ حالی شاعر اور نثر نگار تھے۔نظم میں اُن کا درجہ مصلح کا ہے۔نثر صفائی اور تازگی کا نمونہ

ہے سلاست اور سادگی کا جو اصُول اُنہوں نے
قائم کیا ہے، اُس پر عمل کر دکھایا ہے۔ اُدھر
شبلی زندگی کے ساتھ قدرت سے طبع رنگین
لے کر پیدا ہوئے تھے اور وہ رنگینی جا بجا
اُن کی نظم و نثر میں نظر آتی ہے"
ایک جگہ داغ، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔
" یہ تینوں حضرات میرے جگری دوست تھے
جو وقت میں نے اُن کے ساتھ گزارا ہے
وُہ میری زندگی کے بہترین لمحات میں سے ہے"

معیارِ زندگی سے محبّت

معیارِ زندگی میں توازن

(۱) اپنے مضامین میں جا بجا ایسی مفید باتیں بیان
کر جاتے ہیں کہ اُن پر بار بار غور کرنے کو دِل
چاہتا ہے۔ معیارِ زندگی سے محبّت کرتے ہوئے
فرماتے ہیں کہ " اگر کسی مُلک کے باشندوں کی ہمت

لیاقت، قوت ایجاد، شوقِ سفر اور تجارت اُسی تناسب سے ترقی نہ کریں جس نسبت سے اُن کا معیارِ زندگی بلند ہوتا جائے تو اُسے یقیناً روزِ بد دیکھنا پڑے گا۔"

سادگی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اپنے بزرگوں کی دانائی سے سبق لینا چاہیئے اور اپنے اِس سیدھے سادے طریق پر قائم رہنا چاہیئے جس سے نہایت غریبی میں بھی زندگی کے دِن کاٹ دینے مشکل نہ ہوں۔"

خدمتِ قوم کے متعلّق ان کی رائے اور عمل صرف انجمن سازی تک ہی محدود نہ تھا۔ وہ کئی دوسرے پہلوؤں سے بھی قوم کی بہبود کے لئے کوشاں رہتے تھے اور اس کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔

شیخ صاحب کی زبان میں کچھ ایسی تاثیر اور تقریر میں ایسی دلفریبی تھی کہ ہر شخص ان کی طرف کھنچا چلا آتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ شیخ صاحب کو

اسی سے خاص نسبت اور تعلقِ خاطر ہے۔ عبدالمجید سالک مرحوم اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں:۔

"شیخ عبدالقادر سے جب کبھی نیاز حاصل ہوا، طبیعت نے نہ صرف قوت محسوس کی بلکہ اُن کے بے پناہ خلوص کی وجہ سے اِس قسم کی کشش پیدا ہوئی جیسی کشش چھوٹوں کو اپنے شفیق بزرگوں کی طرف ہوا کرتی ہے"!

آخری سفر

ایک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد شیخ صاحب ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو رحلت فرما گئے۔ آپ کی عمر اُس وقت ۷۶ سال کی تھی۔ مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ اُن کی پوری زندگی ایک ایسی کتاب ہے جس کے ہر باب میں انسانی شرف و وقار کے لئے درسِ حیات ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

ابتدائی ایام

اِس حصّہ میں ہم شیخ صاحب مرحوم کی زندگی کے پہلے تیس پینتیس سال کا مختصر جائزہ لیں گے ۔ اِس عرصہ میں شیخ صاحب نہ تو ابھی کامیاب بیرسٹر بنے تھے اور نہ سر عبدالقادر تھے ۔ ایک بھولا بھالا لڑکا جو زندگی کے اُفق پر اُبھرنے اور چمکنے کے لئے بے تکان تگ و دَو کر رہا تھا ۔ یہ لڑکا ابھی پندرہ سال ہی کا تھا کہ اُس کے والد انتقال فرما گئے ۔ عزیز رشتہ دار مُنہ موڑ چکے تھے ۔ ایک کم مائیگی اور دوسرے بیوہ بہنوں کی کفالت کا بوجھ ۔ بیوہ ماں کے آنسو سامنے تھے ۔ تعلیم کا شوق تھا مگر اثاثہ اِتنا

نہیں تھا - آخر آپ کی والدہ نے ایک قرابت دار کی
منت سماجت کر کے اِس لڑکے کو ایک انگریز افسر
کے پاس تلاشِ روزگار میں بھیج دیا - مگر اِس انگریز نے
اِس نوجوان کے چہرے سے اُس کی ذہانت کا اندازہ
کر لیا اور تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے
کہا کہ "میں اِس کے اندر ایک عظیم الشان شخصیت
پاتا ہوں - اِس کو تعلیم دلاؤ، چاہے محنت کر کے
یا قرضہ لے کر یا چوری کر کے (انگریزی محاورہ) روپیہ
حاصل کرنا پڑے۔"

شیخ صاحب جو ابھی بچّے ہی تھے، ہمّت میں
بڑوں کا مقابلہ کرتے تھے - چنانچہ پڑھائی جاری
رکھی - ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات - اگلے ہی
سال انٹرنس کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کر کے
وظیفہ حاصل کیا - اِس سے پہلے مڈل میں بھی آپ
وظیفہ حاصل کر چکے تھے - اِس سے اَور ہمّت بندھی۔

شیخ صاحب مرحوم ۱۵ ، ۱۶ برس کی عمر میں

اور فارمن کرسچن کالج میں داخل ہو گئے۔ اور بی۔ اے بھی اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ چونکہ مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس لئے ملازمت کی تلاش ہوئی۔ اور کالج سے فارغ ہوتے ہی تھوڑا عرصہ معلّمی کی لیکن طبیعت میں لکھنے پڑھنے کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کا ایک تلاطم اُن کے ذہن میں موجیں مار رہا ہے۔ فوراً ہی اخبار نویس بن گئے اور ایک انگریزی اخبار "آبزرور" کی سب ایڈیٹری قبول کر لی اور بعد میں چیف ایڈیٹر بن گئے۔ اُنھوں نے ادب و صحافت میں نئے دَور کا آغاز کیا۔ جب ۱۹۰۱ء میں اُنھوں نے اُردو کا ذاتی رسالہ "مخزن" نکالا تو آپ کی شُہرت کو چار چاند لگ گئے۔ کیونکہ اِس رسالے کی وجہ سے اُنھوں نے تمام برِّصغیر کے صحافیوں کے لئے ایک نیا باب کھول دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے نوجوانوں پر انگریزی زبان کا جنون سوار تھا۔ اِس وقت

اُنھوں نے اُردو زبان کی ترقّی کے لئے کمر باندھی اور لوگوں کو یقین دِلا دیا کہ اِس زبان میں ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی پوری وسعت و صلاحیت موجود ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی خواں نوجوان بھی اُردو میں لکھنا پڑھنا، شعر کہنا اور سمجھنا باعثِ فخر سمجھنے لگے۔ اور ایسا شوق پیدا ہو گیا کہ غالبؔ، میرؔ اور دُوسرے شعراء کا کلام پڑھنا اور جاننا ایک فیشن ہو گیا۔ انگریزی کتابوں کے تراجم عام ہونے لگے۔ بہر حال "مخزن" نے اُردو کی شاہراہ میں ایک سنگِ میل کا کام ہی نہیں دیا بلکہ بہت اُونچے کھڑے ہو کر ایک روشنی کے مینار کا کام دِیا۔

شیخ صاحب کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ بتیس سال کی عمر میں وہ بیرسٹری کے لیے ولایت گئے اور اپنی طالب علمی کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ کو عمیق نگاہ سے دیکھتے اور "مخزن" کے لئے مضامین

لکھتے رہے۔ کورس پُورا کرنے کے بعد انہوں نے یورپ
کا سفر اختیار کیا اور جس گہری نگاہ سے اُنہوں نے
اس برِّاعظم کی اور خصوصاً استنبول کی زندگی اور
معاشرت کا جائزہ لیا وُہ یقیناً اُن ہی کا حِصّہ تھا۔
ہر چیز جو اُن کو بھاتی رہی وُہ اُن کی تحریر بنی۔
اُن کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اپنے مُلک کے
نوجوانوں کو بیدار کرکے اچھی اچھی باتیں بتاتے رہیں۔
وُہ اپنے سفر کے دَوران میں وہاں کے پُورے
معاشرے کا مطالعہ کرتے رہے اور ہر بات کو اُنہوں
نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی پرکھا۔ اور اپنی مُلکی
تہذیب اور تمدّن سے تقابل بھی ملحوظ رکھا۔ اپنے
مُلک کی بیداری اور اصلاح ہر وقت مدِّ نظر تھی۔
چنانچہ جس وقت تعلیم سے فارغ ہو کر وُہ اپنے
وطن تشریف لائے تو بمبئی میں جہاز سے اُترتے
ہی مخدومِ قوم نواب محسن الملک بہادر نے ہار پہنایا اور

پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور وہ ایسی محبت سے پیش آئے
کہ تین سال کی غریب الوطنی بھول گئی۔ پھر بمبئی،
گوالیار، دہلی، جالندھر، امرتسر اور لاہور غرضکہ ہر جگہ
اسلامی اور ادبی انجمنوں نے ریلوے اسٹیشنوں پر اور
جلسہ گاہوں میں پُرخلوص اور دُھوم دھام سے استقبال
کیا۔ لاہور کے استقبال کرنے والے دوستوں میں
میاں محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہ دین مرحوم بھی تھے۔
عام لوگوں نے گاڑی کا گھوڑا کھول دیا اور خود کھینچ
کر لائے؟ اب شیخ عبدالقادر مدیرِ مخزن کے علاوہ
بار ایٹ لاء بھی تھے اور زندگی کی دَوڑ میں حصّہ
لینے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ چاق و چوبند۔

ازدواجی زندگی

شیخ عبدالقادر جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں مثالی کردار رکھتے تھے وہاں اُن کی گھریلو ـــــ ازدواجی زندگی بھی بے حد خوشگوار تھی۔ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے بعد جب اپنے گھر میں قدم رکھتے تھے تو اُن کے چہرے پر تھکن یا گرانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا وُہ مُسکراتے ہوئے آتے، لباس تبدیل کرتے اور اُس کے بعد گھر کے معاملات میں بھی اسی دلچسپی اور رغبت کا اظہار کرتے جس کا وُہ اپنی مجلسی یا منصبی زندگی میں دن بھر کرتے رہتے تھے۔ گھر کے افراد سے اُن کا سلوک نہایت مشفقانہ اور مربیانہ ہوتا۔ بیوی بچوں

اور دوسرے اعزّہ کی باتیں غور سے سنتے، انہیں صحیح مشورہ دیتے، جہاں ضرورت ہوتی خود مدد کے لئے بھی تیار ہو جاتے۔ اور کبھی اپنے آپ کو ان سے الگ یا ممتاز نہ سمجھتے۔

جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے ازدواجی کردار کی عظمت پر گواہی دیتے ہوئے اُن کی بیگم نے فرمایا :-

"ہماری شادی کو بیالیس سال ہوئے۔ اس طویل عرصہ میں ہم میں کبھی کسی بات پر جھگڑا نہیں ہوا۔"

یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ کسی کی بیوی اُن کی صلح جوئی، شرافت اور کردار کو اس قدر پائدار خراجِ تحسین ادا کرے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بہت کم مثالیں ملتی ہیں کہ اتنی طویل مدت کے دَوران میں میاں بیوی میں کبھی کوئی جھگڑا نہ ہوا

ہو ۔ لیڈی عبدالقادر فرماتی ہیں :۔

"ہماری خوشگوار زندگی کا ہمارے بچوں کی تربیت پر بہت خوشگوار اثر ہوا۔"

بے شک جھگڑالو والدین کی اولاد کبھی متوازن دل و دماغ اور اعلےٰ کردار کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اور اس نقطے کو سر عبدالقادر سے زیادہ بھلا کون سمجھ سکتا تھا۔ بیگم صاحبہ آگے چل کر فرماتی ہیں :۔

"آپ ہمیشہ خوش رہتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی کبھی رنجیدہ نہ ہوئے۔ ملازمین کے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا تھا۔"

پھر فرمایا :۔

"کاغذات سے آپ کو بہت لگاؤ تھا اور کسی کاغذ کو کبھی ضائع نہ ہونے دیتے تھے۔ اس معاملے میں بڑی سختی سے ہدایات دے رکھی تھیں جن پر باضابطہ عمل ہوتا تھا۔ چنانچہ آج آپ کی یادداشتوں

کے کاغذات سے کئی صندوق اٹے پڑے ہیں!"

شیخ صاحب کی سادگی اور بے نفسی کا ذکر کرتے ہوئے بیگم صاحبہ نے فرمایا:۔

"آپ کی سادگی پسندی کا یہ عالم تھا کہ کئی دفعہ معمولی کپڑوں ہی میں باہر چلے جاتے اور جب میں ٹوکتی کہ لوگ کیا کہیں گے، تو ہنس کر فرماتے۔ لوگ مجھے دیکھیں گے، نہ کہ میرے لباس کو۔"

اپنے دور کے اس عظیم انسان کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا تھا۔ جس طرح اُنھوں نے اپنی جوانی میں اپنی بہنوں کو یتیمی کے احساس سے دُور رکھا اسی طرح تمام عمر ان کی خاطرداری کو اپنا فرض جانا۔ چنانچہ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں:۔

"آپ کی ایک بڑی بہن تھیں، وہ ہمیشہ آپ کے پاس رہیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرحوم کے خاندان کے اکابر کا خیال ہے کہ آپ اُنھی کی دعاؤں

سے پھلے پھولے۔ ہمشیرہ صاحبہ عموماً شیخ صاحب کے
پاس آتیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں دیر تک کرتی رہتیں
اور شیخ صاحب اپنا مضمون وغیرہ جو کچھ لکھنا ہوتا لکھتے
رہتے اور ان کی باتوں کا جواب بھی دیتے رہتے۔
ایک دن شیخ صاحب کوئی نہایت ضروری مضمون لکھنے
میں مصروف تھے اور ہمشیرہ صاحبہ حسبِ معمول مسلسل
باتیں کیئے جا رہی تھیں۔ مَیں نے چاہا کہ ہمشیرہ صاحبہ
کو کسی بہانے سے دوسرے کمرے میں لے جاؤں تاکہ
شیخ صاحب کے خیالات منتشر نہ ہوں۔ شیخ صاحب
جھٹ بھانپ گئے اور مجھ کو انگریزی میں کہا۔ ہمشیرہ
کو باتیں کرنے دیں۔ مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی اس بہن کی دعائیں
شیخ صاحب کے شاملِ حال رہیں۔ لیکن جو لوگ شیخ
صاحب مرحوم سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے
ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں ہر اُس شخص نے دِل

سے دُعا دی جس کا اُن سے ایک بار بھی معاملہ ہوا۔
اُن کی ذات ایک ایسی شمع تھی جس کا اُجالا محدود
نہیں تھا۔ وہ سب کے لئے تھے اور آج سب ہی
اُن کو یاد کرتے ہیں۔

اُن کی بڑی ہمشیرہ اُن سے بیس سال بڑی تھیں
شیخ صاحب اُن کا بے حد ادب کرتے تھے اور اُن
کی ہر بات مان لیتے تھے۔ حتیٰ کہ جب سٹیٹ سکالرشپ
پر ولایت جانے کی منظوری ملی تو اُنہوں نے اِس
وظیفہ کو اِس بنا پر قبول نہیں کیا کہ ہمشیرہ بھائی
کی جُدائی گوارا نہ کرتی تھیں۔

ایک اور بیان میں لیڈی عبد القادر فرماتی ہیں:۔

"شیخ صاحب مرحوم کے صبر اور توکّل کی یہ انتہا تھی
کہ بیماری کے ایّام میں کبھی ہائے نہیں کہا اور کوئی
فریاد نہیں کی۔ اُن ہی دنوں خارش کی تکلیف میں اضافہ
ہو گیا اور یہ مزید تکلیف دو ماہ رہی لیکن کبھی بھی اِس

تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔"

بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ :۔

"مرحوم صبح اور عشاء کی نمازیں اکثر پڑھا کرتے تھے۔ ولایت کے آخری سفر کے دوران میں وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں تھیں۔ اُنہوں نے کبھی شراب کا استعمال نہیں کیا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر نے دوائی میں برانڈی مِلا دی تو اُنہوں نے وہ دوائی گِرا دی اور خدا پر بھروسہ کرکے اپنی احتیاط سے کام لیا۔ دوا آتی تھی لیکن وہ چُپ کرکے گِرا دیتے تھے۔"

ولایت کے حالات کے مطابق بیگم صاحبہ نے خود کپڑے دھونا مناسب سمجھا اور یہ خیال کرکے کہ ریشمی کپڑا جلد دُھل جاتا ہے کچھ قمیصیں ریشمی بنوا لیں۔ شیخ صاحب نے دینی عقیدہ کے ماتحت اِن قمیصوں کو استعمال نہیں کیا اور کہا کہ کسی بچے کو دے دو۔

کوٹھی تیار ہونے پر بیگم صاحبہ کا ارادہ اِس کوٹھی کا نام "قادر منزل" رکھنے کا تھا۔ لیکن وُہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ روپیہ میرا خرچ نہیں ہوُا تو میرا نام کیسے رکھا جائے۔

مجلسی زندگی

بچپن ہی سے شیخ صاحب کی زبان میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ہر شخص اُن کی طرف کھچا چلا آتا تھا۔ اُن کی اِس ہر دلعزیزی اور رواداری کے اوصاف ساری عُمر اُن میں نمایاں رہے۔ ہم نے اُنہیں ہر غریب و امیر سے خندہ پیشانی کے ساتھ اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ شیخ صاحب اُن کے اپنے آدمی ہیں۔ آپ ہر موضوع پر اور ہر پہلو سے گفتگو کر سکتے تھے۔ اور یہی بات اُن کی تقریروں میں کامیابی کا راز تھی۔ جس بے تکلفی کے ساتھ اُردو لکھتے تھے اُسی

بے تکلفی کے ساتھ بولتے بھی تھے۔ اور اُن کے لب و لہجہ سے ہرگز معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ گفتگو اپنے طور پر بھی ایک جوہر اور ایک آرٹ ہے۔ عام لوگ بات بات میں غلطی کرتے ہیں۔ اور برجستہ بولنا تو بڑی بات ہے برمحل بولنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ شیخ صاحب جیسے بڑے لوگوں میں ایک یہ خوبی ہوتی ہے۔ کہ وُہ کلام کے دھنی ہوتے ہیں۔ سکالر ہونا ایک الگ بات ہے اور مجلسی ہونا اَور بات ہے۔ شیخ صاحب اِن دونوں باتوں میں یدِ طُولیٰ رکھتے تھے۔

اوائل عُمر ہی میں اِس چاند کے گرد کئی ستارے جمع ہو گئے تھے۔ اِن ستاروں میں ڈاکٹر اقبال، مولانا حسرت، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، نادر کاکوروی، شاہ عظیم آبادی اور بعد میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق وغیرہ شامل تھے۔ کسی

مشاہد

صاحب نے کیا خُوب لکھا ہے : "اِس عہد کے نوجوانوں نے اُنہیں ادبی مجلسوں کے صدر کی حیثیت سے دیکھا۔ جس محفل میں آپ موجود ہوتے تھے اُس کا صدر خواہ کوئی ہو، اہلِ مجلس شیخ صاحب ہی کو صدر سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ صاحب کی شرکت سے ادبی مجالس کا وقار بہت بڑھ جاتا تھا لیکن شیخ صاحب کو بعض دوسرے اکابر کی طرح صدارت کی خواہش ان مجالس میں نہیں ہوتی تھی۔ اِس کا ذمہ دار اُن کا وُہی پُرانا زبان و ادب کا عشق تھا۔ جس کی وجہ سے اِس عہد کے نوجوانوں کی طرح اب سے نصف صدی پہلے کے بڑے بوڑھوں نے نوجوان عبدالقادر کو اِس ذوق و شوق سے اپنی ادبی محفلوں میں شامل ہوتے دیکھا تھا۔ اُن کی طبیعت میں بڑی شگفتگی تھی۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے اپنی دلآویز گفتگو سے اُسے چار چاند لگا دیتے تھے۔"

آپ مجلس آرائیوں کے بہت دِلدادہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اِن محفلوں میں آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے اپنے ایک مضمونِ "مجالسِ تفریح" میں لکھتے ہیں:۔

"اہلِ یورپ کی موجودہ تمدّنی ترقی کے اجزا میں ایک جزو اُن کی تفریحی مجالس بھی ہیں جن کو انگریزی میں "کلبز" کہتے ہیں۔ Clubs کلب

ڈاکٹر جانسن جو انگریزی کے ایک مشہور جامع لغت کے مؤلّف اور علمی تنقید کی بنا ڈالنے والے عالم گزرے ہیں، اپنے دن بھر کے کام کے بعد کلب میں جا کر بیٹھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایک کلب اُن کے مذاق کی اُن کو مل گئی تھی۔ اِس میں کچھ اور بھی تصنیف و تالیف کے شائق آمد و رفت رکھتے تھے۔ گولڈ سمتھ سا قادر الکلام مضمون نویس، برک سا جادو بیان فصیح، رینالڈ کا سا مصوّر اِس مجلس کے ممبروں میں تھے۔ اِن سب کے بہترین نتائجِ طبع

انہی دنوں کا ثمرہ ہیں۔ جب یہ لوگ مل بیٹھتے تھے
صفائی سے ایک دوسرے پر نکتہ چینیاں ہوتی تھیں،
دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں، ایک کی مثال دوسرے کو
اُکساتی تھی اور نہایت عمدہ اثر ان ممالک کے علمی
ذخیرہ پر پڑتا تھا۔ اس طرح اس کلب نے ملک کی
علمی حالت پر بیّن اور مفید اثر ڈالا تھا۔"

اِن مجلسوں کے بارے میں مزید لکھتے ہیں :۔

"ان میں سے اکثر مجلسوں میں ایسے مشاغل بھی
ہیں جو بیک کرشمہ دو کار کا حکم رکھیں۔ یعنی دِل
بھی مل جاتا ہے اور علمی یا عملی فوائد بھی حاصل ہو
جاتے ہیں مثلاً 'عمر خیام کلب' کو لیجیئے۔ جو لوگ
اخبار دیکھتے رہتے ہیں اُنھوں نے تو بالخصوص اُس
کی لمبی لمبی رپورٹیں بھی دیکھی ہوں گی۔ اس کا آغاز
چند ایسے علم دوست انگریزوں سے ہُوا جو فارسی
زباندانی کے شوقین تھے اور فارسی شاعری میں عُمر

خیام کی مشہور رباعیات کو خصوصاً پسند کرتے تھے۔ معمولی انگریزی کتابیں پڑھنے اور روز مرہ کے کام کے بعد۔ اُنہیں عمرخیام کی رُباعیات میں ایک جدت ملتی تھی جو فرحت بخش تھی اور جو اُن کے تھکے ہوئے دماغوں کو بہت کچھ آرام دیتی تھی۔ لیکن فرق یہ ہو گیا کہ آگے تو اُن میں سے ہر شخص اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کر دل خوش کر لیتا تھا اور ڈرتا تھا کہ بعض اس کے ہم قوم اسے کسی قدر مجنون سمجھیں گے کہ ایک ایرانی شاعر کو خوبیوں کا پُتلا سمجھتا ہے۔ اور اب اس طرح ایک مجلس کے ذریعے سے انہوں نے یہاں تک کامیابی حاصل کر لی کہ اور سینکڑوں اور ہزاروں کو اپنا ہم خیال بنا لیا جو اُن سے بھی بڑھ کر عمرخیام کے کلام کے دلدادہ ہو گئے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ جمہوری سلطنت کی خوبیوں کی طرف جو آج کل تمام
دُنیا کی تعلیم یافتہ طبائع جُھکی پڑتی ہیں۔ یہ یورپ اپنی
مضبوط پارلیمنٹوں اور کونسلوں پر جو فخر کرتا ہے،
ہندوستان کی اقوام میں سے وہ حصّہ جو سب سے
زیادہ نئی۔روشنی سے مستفید ہُوا ہے۔ہندوستان کی
ترقی کے واسطے ہندوستانی کونسل اور پارلیمنٹ کی
خواہش کرتا ہے۔ یہ صرف اُس پُرانے اصُول کی
خوبیوں کا بے ساختہ اقرار ہے۔ یعنی یہ کہ ایک بادشاہ خواہ
وہ کیسا ہی بیدار مغز اور فہمیدہ ہو مصالحِ مُلکی پر غور کرنے
کے لئے ہرگز تنہا ایسا مفید نہیں ہو سکتا جیسے ایک مجمع
جس میں رعایا کے لائق ترین اشخاص شامل ہوں اور
سب کے سب اپنی دماغی طاقت کو اُس کے ساتھ
مل کر خرچ کریں۔ اِس اصُول پر ابتدائے اسلام میں مسلمانوں
نے عمل کر کے دِکھایا۔ اِس سے نمایاں نتائج پیدا کئے۔
مگر افسوس کہ اب وُہ ایسی حالت میں ہیں کہ اُنہیں

وہی باتیں دُور سے دوسروں کے پاس نہایت عجیب
اور نئی معلوم ہوتی ہیں۔"

ہر شخص کے لئے آپ کے دروازے کھُلے تھے۔ کوئی کسی وقت چلا جائے آپ بہت تپاک سے ملتے اور ہر ممکن مشورہ اور مدد سے ممنون کرتے تھے۔ جن لوگوں سے زیادہ تعلقات تھے اگر اُن سے ملاقات میں دیر ہو جاتی تو نہ ملنے کا گلہ کرتے۔ وفات سے ایک سال پیشتر ایک دفعہ حفیظ ہوشیارپوری آپ سے ملنے گئے۔ لیکن باہر سے اُن کا حال دریافت کر کے چلے آئے۔ شیخ صاحب کو جب معلوم ہوا تو شکایت کی۔

شیخ صاحب مرحوم کی وفات پر کئی احباب نے حروفِ ابجد کے حساب سے قطعات بھیجے جن سے تاریخِ وفات ۱۳۴۹ھ کا ہندسہ نکلتا ہے۔ جو مجھے پسند ہے وُہ یہ ہے:-

جو شمع بجھ گئی یہاں، وُہ خُلد میں ہے ضوفشاں
چراغِ محفلِ ادب۔ چراغِ محفلِ ادب

دینی خیالات

شیخ صاحب بڑے دیندار آدمی تھے۔ غُربا و مساکین کا خیال رکھنا اپنا فرض جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مُلک بھر کی اسلامی انجمنوں نے اپنے سر کا تاج بنائے رکھا تھا۔ آپ اِن اِداروں کی دامے، درمے، قلمے سخنے خدمت کرتے رہتے تھے۔ آپ مذہبی جھگڑے جھمیلوں کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔

شیخ صاحب کا بے پناہ حِلم، اخلاقی اور اِنسانی ہمدردی خوفِ خدا اور دینی جذبات کے پیشِ نظر تھا۔ آپ نے اِس خیال کو احباب کے سامنے کئی بار دُہرایا کہ :-

"یورپ کی تعلیم گاہوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنی

توحید کے نظریہ کو وُہ زیادہ سے زیادہ اپناتے جا رہے ہیں۔ یہ تخیّل اُنھوں نے اسلام سے لیا ہے۔ جس طرح کہ کھانے پینے، طہارت اور لباس میں بھی کئی باتیں اُنھوں نے ہمارے تمدّن سے لی ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی طرح بھی تسلیم کر لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ نہ تحریری نہ زبانی۔"

ایک شُکر گزار کا تصوّر باندھتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خُدا کی شُکر گزاری کا عملی ثبوت، اُس کے ایسے بندوں کے ساتھ جو سرو سامان نہیں رکھتے، بھلائی کرنے سے دُوں گا۔ گرما میں اپنے خس خانہ و برفاب سے آرام پاتے ہوئے غُرباء کو کم از کم ٹھنڈا پانی تو پلاؤں گا۔ سرما میں اپنے حماموں اور انگیٹھیوں سے آسائش حاصل کرتے ہوئے یہ بھی ذہن میں رکھوں گا کہ کتنے ایسے بھائی ہیں جن کے پاس آگ تاپنے کو نہیں۔ کمبل اوڑھنے کو نہیں، گدڑی بچھانے کو

نہیں اور یہاں تک کہ کہیں چیتھڑا بدن ڈھکنے
کو نہیں۔ میں اپنی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ بناؤں گا
کہ جہاں اپنے لئے لباسِ حریر و سمور یا کامل و
بانات کے سُوٹ سِلاؤں گا وہاں بے سرو سامانوں
کے لئے کچھ موٹے جھوٹے سُتنے چھینٹ کے یا کسی
سستے گرم کپڑے کے بھی تیار کرا دوں گا۔"

(بے سرو سامانی)

شیخ صاحب شراب کو دینی اور دُنیاوی ہر لحاظ
سے بُرا جانتے تھے۔ چنانچہ عثمانیوں کے حالات بیان
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عثمانیوں کی ایک خوبی: آج تک بہ حیثیت قومی
شراب سے پرہیز قائم رکھنے میں اپنے اسلام کی پختگی
کا ثبوت دیا ہے ۔۔۔۔ یورپ بھر میں شراب
کے استعمال کی کثرت ایک ایسی وبا ہے جس کا زہریلا
اثر وہاں کے دُور اندیش عرصے سے محسوس کر رہے ہیں

".... عثمانیوں کو یہ شعارِ اسلامی نباہنے سے
کئی قسم کے فائدے ہوئے ہیں جن میں سے ایک
فائدہ یہ ہے کہ اُن کی سپاہ صُوفی سپاہ ہے۔
اور اُن کے عسکریوں کی بہادری شراب سے جوش
میں لائے جانے کی محتاج نہیں اور اِس پر ایسی
ہے کہ پینے والے بہادروں کے نشے اُتار دیتی ہے۔
البتہ جہاں شراب سے عثمانیوں نے پرہیز کیا ہے
وہیں تمباکو کے استعمال میں دیگر اقوام یورپ کو
بھی مات کر دیا ہے۔"
لیکن شیخ صاحب نے اسے بھی نہ اپنایا۔ چنانچہ
لکھتے ہیں :-

" مجھے جب کبھی عُذر کرنے کا اتّفاق ہوا تو
میرے عثمانی میزبان عموماً نہایت ہی تعجب سے
پُوچھتے تھے۔" کیا تمہارے ہاں لوگ جغارہ (سیگار)
نہیں پیتے؟" میں کہتا تھا۔ "ہمارے ہاں بھی بہت

سے اِس کے شائق ہیں۔ مگر آپ سے کم۔ اور میں
اُن لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے نئی تہذیب کا
یہ تمغہ نہیں حاصل کیا!‘‘ . . . . (عثمانی معاشرت)

قسطنطنیہ میں ایک عبادت گاہ ’’ ایا صوفیہ‘‘ کا ذکر
جس پیرائے میں کیا ہے اِس سے اُن کی دینی محبّت
اور سچّا مُسلمان ہونے کا ثبوت مِلتا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

’’سجدہ کی آرزو ہو تو قسطنطنیہ میں ایا صوفیہ سے
زیادہ کونسی جگہ اِس کے لئے موزوں ہو گی۔
محرابِ مسجد کے قریب بڑے بڑے قلمی قرآن مجید
رحلوں پر دھرے ہیں۔ آنے جانے والے اُن کی
زیارت کر سکتے ہیں اور بہت سے لوگ وہاں بیٹھے
اُنہیں پڑھتے بھی رہتے ہیں۔ جس وقت میں اور
میرا ہمراہی وہاں گئے تو ایک غریب لڑکا حفظِ قرآن
میں مشغول تھا۔ ہم نے اُس سے کہا، ذرا قرأت تو
سناؤ۔ اُس نے نہایت عُمدگی اور محبت سے پڑھ کر

سُنایا جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے قرآنِ شریف کا جسے ہم حکمتوں کا خلاصہ مانتے ہیں ایا صُوفیہ میں پڑھا جانا ہمیں بہت موزوں معلوم ہوا کیونکہ صُوفیہ کے معنی یونانی میں دانش و حکمت کے ہیں اور یہ گرجا حکمت کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اب جامع اسلامی بن گیا تو بھی قرآن مجید کی بدولت کانِ حکمت رہا۔"

مسجد کمیٹی جس کے پریزیڈنٹ شیخ الاسلام استنبول تھے، شیخ صاحب نے ۱۹۱۱ء میں اُن کی جنرل کمیٹی کی ممبری منظور کر لی اور اپنے رسالہ مخزن کے ذریعہ چندے کی پُرزور اپیل کی۔ ایک جگہ پُرزور الفاظ میں فرمایا: "لندن میں آخر ایک عالیشان مسجد تعمیر ہو کر مُسلمانوں کے لئے خیر و برکت اور فلاح کا مُوجب ہوگی"

ایک دفعہ ریڈیو پر اِس موضوع پر تقریر کی کہ اُن کی زندگی میں تین اشخاص کا اُن کے خیالات پر

زبردست اثر تھا اور اِن تین اشخاص میں شیخ الاسلام استنبول بھی تھے۔

انگریزی خوانوں میں رہتے سہتے ہوئے بھی چہرۂ مبارک پر داڑھی کا تمغہ آپ کی دینداری کا ایک نشان تھا۔

شیخ صاحب جب برلن کی مسجد کو دیکھنے گئے تو ایک خواہش مند جرمن کو باقاعدہ مسلمان کیا اور اسلامی طریق سے بیعت لی ٭

غیر ملکی سیاست

شیخ صاحب نے اپنی زندگی میں بہت سے غیر ملکی سفر اختیار کیئے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں آپ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور ۱۹۰۷ء تک وہیں رہے۔ اور بیرسٹری میں عدیم المثال کامیابی حاصل کرنے کے بعد واپسی پر سیر و سیاحت کی غرض سے ترکی تشریف لے گئے۔ قسطنطنیہ میں نامور ہستیوں، بڑے بڑے پاشاؤں اور ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی مرحوم سے ملاقاتیں کیں اور سلطانِ عالی، سر عبدالقادر کی شخصیت علم دوستی اور قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تمغہ

حمیدیہ عطا فرمایا۔

اِس کے بعد اگست ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے آپ کو جنیوا کانفرنس کے لئے منتخب کیا اور آپ نے یورپ جا کر اِس فرض کو اِس عمدگی اور خوبی سے سرانجام دیا کہ دشمنوں نے بھی تعریف کی ۔ ۱۹۲۴ء میں وزیرِ ہند مقیم لندن کی کونسل کے ممبر بنے اور پانچ سال تک وہاں رہے۔

سر عبدالقادر جتنی دفعہ بھی غیر ممالک میں تشریف لے گئے ۔ بظاہر اُن کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو۔ مگر بادی النظر میں اُن کے سامنے حصولِ علم ، جستجو ، اور دوسری اقوام کی طرزِ بود و باش معلوم کرنا تھا۔ اور پھر اس کی نیک اور صالح اقدار کو اپنے ملک میں رائج کرنے کے خواہشمند نظر آتے تھے ۔ چنانچہ یہ جذبہ اُنہیں کسی پہلو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اور اکثر اِس کا ذکر کرتے تھے۔

یورپی ممالک کی سیر میں بڑے بڑے فلسفہ دانوں، شاعروں اور ادیبوں سے راہ و رسم بڑھائی۔ کئی موضوعات پر بحثوں میں حصہ لیا۔ مگر ہر آن اپنے ملک کی حالت کو سامنے رکھا۔ وطنِ عزیز کی آزادی اور اپنی قوم کی خوشحالی کا خیال کسی لحظہ بھی اپنے ذہن و قلب سے الگ نہ کیا۔ مثلاً اپنے ایک مضمون "گھر سے نکل کر دیکھو" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"وقت آپہنچا ہے کہ ہند جاگے اور اس کے ساتھ اہلِ ہند کی قسمت اور ہندوستان والے بھی دُنیا کی معزز صنعتی اور تجارتی اقوام کی مجلس میں برابر کی کرسی لیں۔

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی کی تدبیریں کیا ہیں؛ تدبیریں تو مختلف ہیں اور سب اپنی جگہ ضروری۔ مگر ہندیوں کا بکثرت دُنیا کے دوسرے ملکوں میں پھیل جانا اُن میں سے ایک تدبیر ہے جس کی

اہمیت میرے دل پر روز بروز نقش ہوتی جاتی ہے۔ صنعتی تعلیم کے لئے سفر درکار ہے۔ تجارتی تعلقات بڑھانے کے لئے سفر درکار ہے۔ محنت مزدوری کے ذریعے ڈھونڈنے کے لئے سفر درکار ہے۔ مگر اِن کے علاوہ بعض اَور فوائد دوسرے ممالک میں چندے قیام پذیر رہنے سے وابستہ ہیں جن کا احساس وطن میں کم ہوتا ہے اور زیادہ تر وطن کے باہر ہی ہو سکتا ہے۔ دوسری قوموں کے اوضاع و اطوار دیکھنے سے خیالات میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے جو نہایت قابلِ قدر ہے، اور بہت سی ترقیاں اور بہت سی اصلاحیں جو پہلے ناممکن نظر آتی ہیں، ممکن معلوم ہونے لگتی ہیں، اور کئی تعصبات جو پہلے سدِّراہ ہوتے تھے، راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ ہاں اس نتیجے کے مرتّب ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ جو لوگ سفر سے مستفید ہوں وُہ اس کے فوائد کے اخذ

کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہوں ۔ سفر چین کا ہو یا جاپان کا ، روم کا ہو یا ایران کا ، یورپ کا ہو یا افریقہ کا سب سے سبق مل سکتا ہے ، سب سے فائدہ ہو سکتا ہے ، بشرطیکہ کوئی محنت اور لیاقت کے جوہر لے کر نکلے اور ہمّت کی رفاقت نہ چھوڑے ۔"

آگے چل کر ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں :-

"چاہیئے تو یہ کہ ہر انگریز کے جواب میں جو ہندوستان میں تجارت کر کے روپیہ کماتا ہے ایک ہندی تاجر انگلستان میں روپیہ کما رہا ہو ۔ ہر فرانسیسی تاجر کے جواب میں ہندی کی کوٹھی فرانس میں ہو ۔ ایران تجارتی اقوام کے لئے زرخیز منڈی ہے ۔ جب دُور دُور سے قومیں آ کر وہاں سے روپیہ کما سکتی ہیں تو ہندوستان والے جو پاس رہتے ہیں کیوں مستفید نہ ہوں ۔ خلیج فارس کے سواحل پر چند جگہ ہندوستانیوں کی دُکانیں ہیں کیوں اس سے زیادہ نہ ہوں ۔ مُلک کے اندر کے شہروں میں

کیوں ہندی تاجر گھس نہ جائیں۔ روم ہم سے بہت دُور بھی نہیں اور ہمارے ابنائے وطن میں خصوصاً مسلمانوں کا تعلق بھی اس سے گاڑھا ہے۔ روم میں ہر قوم کے تاجر ہیں۔ نہیں موجود تو ہندی ہی نہیں ہیں۔ یہ دروازہ بند ہے، اس کو بھی کھٹکھٹاتے رہو کبھی تو کُھلے گا ہی۔"

اِن اقتباسات سے محض یہ بتانا مقصود ہے کہ اُن کے دِل میں مُلک و قوم کی ترقی، خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے کتنی تڑپ، کتنی اُمنگ اور کتنی جستجو تھی۔ وُہ ہر وقت یہی سوچتے رہتے تھے کہ کاش! ہم بھی دُنیا کی دیگر اقوام کے مقابلے میں ایک پُروقار اور باعزّت قوم کی حیثیت سے کھڑے ہو سکیں۔ ہماری صنعتی اور تجارتی ترقی اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرا سکے، اور ہمارا تہذیب و تمدّن اُن کے تہذیب و تمدّن کی ہمسری اور برابری کر سکے۔ آپ جب بھی غیر ممالک

سے لوٹ کر آتے تھے ، اپنے ملک و ملت کی ترقی اور خوشحالی
کے لئے کوئی نئی سکیم ، کوئی تازہ منصوبہ اور کوئی جامع
اور ٹھوس پروگرام تلاش کر کے لاتے تھے۔

اپنے ایک مضمون "یورپ کے بعض دلچسپ اور تاریخی
نظارے" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"میلان (اٹلی) میں ایک بہت بڑی نمائش انہی
دنوں میں ہو رہی تھی ۔ یہ نمائش انٹرنیشنل یعنی بین الاقوامی
تھی جس میں آسٹریلیا ، بلجیم ، ہنگیریا ، کینیڈا ، کیوبا ، ڈنمارک ،
فرانس ، جرمنی ، جاپان ، انگلستان ، ہالینڈ ، پرتگال ، سوئٹزرلینڈ ،
ٹرکی اور ایران یہ سب ممالک شریک تھے اور سب نے
اپنی اپنی مصنوعات کے نمونے ان میں بھیجے ہوئے تھے
ہماری آنکھیں نمائش میں ہندوستان کو ڈھونڈتی تھیں ،
کہ کہیں اس کا شمار بھی بین الاقوام میں ہے یا نہیں۔
آخر بہت سی تلاش سے خیمہ انگلستان کے سایۂ عاطفت
میں کچھ جے پور کے ظروف اور کچھ بنارس کے دوپٹے ایک

الماری میں سجے ہوئے نظر آئے ۔ معلوم نہیں کس وجہ سے خود انگلستان کا حصّہ اس نمائش میں بہت خفیف تھا پس اس حصّہ میں ہندوستان کے حصّہ میں کیا آتا! ہاں جو موجود تھا یہی غنیمت ۔ لیکن ہمارے ملک کو آئندہ ایسے مواقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے ۔ اور ہندوستان کی مصنوعات کو دُنیا کی منڈیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے"

اِن سطور سے بھی شیخ صاحب کی حُبّ الوطنی عیاں ہے ۔ غرضکہ آپ جب کبھی بھی غیر ممالک میں گئے آپ کی نگاہ نے ہمیشہ اِن چیزوں کو تلاش کیا جن کو اپنانے سے نہ صرف اپنے مُلک کا بھلا ہوگا بلکہ ہمیں دُنیا کے ممتاز مُلکوں کی صف میں لے آئے گا ۔ ہاں اِن سفروں کے لئے آپ نے ایک ہی شرط لگائی ہے :-

"کوئی محنت اور لیاقت کے جوہر لے کے
نکلے اور ہمّت کی رفاقت نہ چھوڑے!"

احباب کے ساتھ خط و کتابت

خط کا جواب دینا ایک اخلاقی فرض ہے۔ مگر آجکل کے زمانے میں بہت کم لوگ ہوں گے جو اس فرض کی ادائیگی میں تساہل سے کام نہ لیتے ہوں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ اور ماحول خودغرضی اور مطلب پرستی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس دور میں اُس وقت تک خط و کتابت کا سلسلہ رہتا ہے جبتک کسی سے کوئی کام ہو اور جب خط کے ذریعے اُس کا یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو خط کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے۔

اس صورت حال کا نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ جب تک

آپ کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا اُس وقت تک آپ
اُسے جاننے کے لئے بیتاب و مضطرب دِکھائی دیتے
ہیں، مگر جب وُہ بات معلوم ہو جاتی ہے تو آپ کے
نزدیک اُس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور آپ خط
پڑھ کر لاپروائی سے ایک طرف پھینک دیتے ہیں یا
جواب کے لئے کسی آئندہ فرصت تک اسے معرضِ
التواء میں ڈال دیتے ہیں اور اِس امر کو بھول جاتے
ہیں کہ مکتوب الیہ بھی کسی بات کو جاننے کے لئے اِتنا
ہی بے قرار ہوگا جتنا کہ اُس کا خط موصُول ہونے سے
پیشتر آپ تھے۔ مگر اِس بات کا احساس صرف اَیسے
افراد کو ہوتا ہے جو اخلاقی اعتبار سے عام انسانی سطح
سے بالاتر ہوتے ہیں۔ تقریباً یہی حال سر عبدالقادر کا
تھا۔ وہ معمولی سے معمولی خط کا جواب دینے میں بھی کمال
فیاضی سے کام لیتے اور ہر خط کا جواب اپنی اوّلین
فرصت میں دیتے۔ آپ بے تکلف لکھتے اور جو بات

کہنا چاہتے اُسے نہایت سادگی اور دِل کش پیرایہ کے ساتھ
بیان کر دیتے۔

ایک طرف آپ اُن کی سیاسی، سماجی، نجی، سرکاری
اور ادبی مصروفیات اور ذمہ داریوں کو ذہن میں رکھیئے
اور دوسری طرف خاصی تعداد میں روزانہ آئے ہوئے
خطوط کو دیکھئے جن کا جواب وُہ بڑی باقاعدگی اور
پابندی سے دیتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں آغا محمد حسین نے
اپنی نظموں کے مجموعہ پر دیباچہ لکھنے کے لئے بھیجا مگر
گوناگوں مصروفیات اور ذمہ داریوں کا یہ عالم تھا کہ
آخری دم (فروری ۱۹۵۰ء) تک اِس پر چند سطریں لکھنے
کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ لیکن اُن کے ہر خط کا
جواب بڑی باقاعدگی سے دیتے رہے جو مصنّف کی طرف
سے یاددہانی کے طور پر اُنہیں لکھے گئے۔ یہاں تک کہ
بیماری اور علالت کے زمانے میں بھی اکثر احباب کے
خطوں کے جواب دیتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب

ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام اور کسی قسم کے ذہنی و جسمانی کام سے اجتناب برتنے کی درخواست کی تو جواب دیا کہ :"خط کا جواب لکھنا تو 'دستی کام' ہے - یہ نہ ذہن سے تعلق رکھتا ہے اور نہ جسم سے۔ اِس کی تو اجازت ہے؟

شیخ صاحب راقم کو اپنا عزیز جانتے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے۔ زندگی بھر اُن سے ملاقات ہوتی رہی اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے چند خطوط درج ذیل ہیں :-

C/o India Office
Lahore . S.W.1
16-11-36

عزیزی شیخ محمد نصیر ہمایوں صاحب سلّمہ

السّلام علیکم - آپ کی بھیجی ہوئی کتاب "یادگارِ وارث" ابھی پہنچی - اسے دیکھ کر مَیں بہت خوش ہوُا۔ آپ نے اس کی

لکھائی، چھپائی اور جلد کے متعلق جو اہتمام کیا ہے، بہت قابلِ داد ہے۔ صاحبِ مصنف کی داد پڑھنے کے بعد دے سکتا ہوں۔ انشاء اللہ حسبِ فرصت شوق سے پڑھوں گا۔ جیسا کہ اُنھوں نے دیباچے میں لکھا، یہ امر افسوسناک ہے کہ ہمارے مشاہیر کے متعلق حالات بہت کم معلوم ہیں اور لکھنے والوں کو باوجود کوشش کے مواد کم میسر آتا ہے، مگر انھوں نے اُردو ادبیات میں ایک دلچسپ اضافہ کیا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ کا قومی کتب خانہ اچھی ترقی کر رہا ہوگا گاہے گاہے اپنے حالات سے مطلع کرتے رہیئے۔

معلوم نہیں برخوردار محمد رفیع کبھی آپ کو ملتا ہے یا نہیں آپ کو یاد ہوگا کہ اسے اپنی بیماری کے دنوں میں خیال تھا کہ وہ اچھا ہوگا تو آپ کے پاس بیٹھ کر کتابوں کا کام کچھ سیکھے گا۔ اب وہ خدا کے فضل سے اچھا ہے۔ اگر کبھی ملے تو اُسے کہیئے کہ کسی وقت آپ کے کتب خانہ میں آ بیٹھا کرے۔ کوئی کتاب پڑھتا رہے اور کسی گاہک سے

بات چیت کرنی بھی سیکھے اور بالکل فارغ بیٹھنے کی بجائے کبھی کسی کے لئے اس کا دل بھی اس طرح بہل جایا کرے۔

زیادہ خیریت۔ سب خورد و کلاں سے سلام دُعا۔ برخوردار منظور قادر بیرسٹری میں پاس ہو گیا ہے۔ انشاءاللہ کچھ عرصے تک واپس لاہور پہنچے گا۔

آپ کا خیر طالب

عبدالقادر

4, Temple Road
Lahore
11-12-40

عزیزی شیخ ہمایوں صاحب

السّلام علیکم۔ مَیں نے کتاب کا دیباچہ جو تحریر کیا ہے اس کا مسوّدہ آپ کو بھیجتا ہوں۔ احتیاط سے چھاپ لیجئے۔ اگر ہو سکے تو صاف پروف مجھے دکھا لیں تاکہ کوئی لفظی غلطی نہ رہ جائے۔

سرورق میں کچھ تبدیلی مناسب سمجھی ہے اور اس کی وجہ دیباچہ میں لکھ دی ہے۔ اُمید ہے آپ بھی اِس تبدیلی سے اتفاق کریں گے۔ والسلام

راقم
عبدالقادر

نوٹ: یہ دیباچہ انہوں نے "بیاضِ سحر" مصنفہ وحید سدید کا لکھا تھا

Bahawalpur

29 - 8 - 46

عزیزم شیخ محمد ہمایوں صاحب

السّلام علیکم۔ مَیں پچھلے دو مہینے یہاں سے باہر تھا اور بیشتر حِصّہ کوہ مری میں۔ آپ کے صاحبزادہ احسن صاحب کا خط اثنائے سفر میں مجھے مِلا تھا اِس لئے ابھی جواب نہیں لکھ سکا تھا۔ آج یہاں پہنچا ہوں۔ آج کی ڈاک میں آپ کا ۲۷ تاریخ کا خط مِلا جس میں احسن کے پیغام کی تائید تھی۔ اب اِس خط میں آپ دونوں کے پیغام کا جواب لکھتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کر کے کہ آپ کی ہمّتِ مردانہ سے اور آپ کے صاحبزادہ کی مویدانہ کوشش سے آپ کے کارخانے کو خدا نے اچھی کامیابی دی ہے، خوشی ہوئی۔ خدا اور ترقّی دے۔ آپ کی یہ خواہش کہ مَیں وقت نکال کر کوئی چیز اقبالؔ کے متعلّق لکھوں اور اس کے متعلّق آپ سے شرائط طے کروں، ملحوظ رہے گی۔ مگر وقت نکالنا ابھی وہی مشکلات رکھتا ہے جو پہلے تھیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ تھوڑے عرصے تک مَیں یہاں کا تعلّق ختم کر کے لاہور آ جاؤں۔ اگر یہ ہو گیا اور پھر خدا نے صحّت و طاقت بحال رکھی تو کوشش کروں گا کہ آپ کی اور آپ کے صاحبزادے کی فرمائش پُوری ہو۔

ہمارے بڑے لڑکے احسان قادر کے متعلّق ابھی ہمیں کوئی مزید خبر نہیں ملی۔ اِسی قدر معلوم ہے کہ وُہ ہندوستان میں ہے۔ ہم سے ابھی نہیں ملا اور نہ کوئی خط و کتابت ہوئی۔ عزیزم احسن صاحب کو دُعا اور خط

لکھنے کا شکریہ۔

آپ کا خیر طلب

عبد القادر

3, Temple Road
Lahore
26-4-46

عزیزم شیخ ہمایوں صاحب سلمہٗ

السّلام علیکم ۔ آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ آج شام کو عزیزم شیخ احسان قادر گھر آ رہے ہیں۔ آپ مہربانی سے ۶½ بجے میرے ہاں آ کر اُن سے ملیں۔

اس کے بعد چند عزیزوں کو اُن کے ہمراہ کھانے میں شریک ہونے کی تکلیف دی گئی ہے۔ آپ بھی ۸½ بجے شام کا کھانا یہیں تناول کریں۔

آپ کا خیر طلب

عبد القادر

نگارشات

جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ شیخ عبد القادر صاحبِ قلم تھے۔ آپ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ آپ نے حالی کا انداز اپنایا۔ اُن کی تحریر میں سادگی، شگفتگی، سلاست اور تنقیدی متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بناوٹ سے پاک، بے لاگ، محبّت اور خلوص کا نمونہ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور قوّتِ بیان بے پناہ تھی۔

شیخ صاحب کے مضامین سادگی کے ساتھ ہی ساتھ نہایت دلچسپ بھی ہیں۔ اِن میں زیادہ تعداد تنقیدی مضامین کی ہے اور طنز و ظرافت کے پہلو کو

کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہ خصوصیات اور خوبیاں بڑی محنت اور مشقّت کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ آپ کی تحریروں میں خیالات، مشاہدات اور تأثرات کا ایک سمندر ہوتا ہے جن کو مختصر سے مضمون میں قلمبند کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔

آپ کے مضامین بسلسلہ "سفرِ یورپ" اور تصنیف "مقامِ خلافت" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے غیر ممالک کی صرف سَیر ہی نہیں کی۔ بلکہ اُن کا قلمی نقشہ کھینچ کر سامنے لا رکھا ہے اور اَیسے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ خود اُن مناظر کی سَیر کر رہے ہیں۔ اپنے ایک مضمون "یورپ کے بعض دِلچسپ اور تاریخی نظارے" میں ایک جگہ جنّتِ ارضی سوئٹزر لینڈ کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

"سوئٹزرلینڈ کا ہر حصّہ وَیسے تو حُسنِ قُدرت کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ مگر لُوسَرن اور اس کے قُرب و جوار

کو یہاں سینری کا خلاصہ کہتے ہیں۔ حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے تو مناظرِ قدرت کا صدر مقام لوسرن ہے۔ کوہ الپس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے دیدار اور اس کے شفاف چشموں کی زیارت اس سے عمدہ مرقع مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر قابلِ دید حصّے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں۔ مناظرِ قدرت کے شیدائی دُنیا کے ہر حصّے سے یہاں آتے ہیں اور محبوبۂ بہار کو بہ صد رعنائی جلوہ گر پاتے ہیں۔"

اور :۔

"پہاڑ کی ایک چوٹی جو سطح سمندر سے پانچ ہزار نو سو پانچ فٹ بلند ہے، صبح وشام سینکڑوں تماشائی اِس چوٹی پر موجود رہتے ہیں اور جو تماشا وہاں اُنہیں نظر آتا ہے، الفاظ اُس کے بیان سے قاصر ہیں۔ تصوّر کیجیے کہ چودہ جھیلیں چھوٹی

بڑی اور اُن کے گرد کے اشجار و انہار، کوہ و

ہاموں، شہر و قریہ سب وہاں سے نظر آتے ہیں۔

اور یہ منظر اہلِ نظر کے دل چھین لیتا ہے۔ اس پر

طرّہ یہ کہ اس سے ذرا اُونچی چوٹیاں اُسی کے قریب

برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں/ انگلستان اور

امریکہ کی عورتیں جو مناظرِ قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی

ہیں اِس جنّت نما کی داد دیتے ہوئے دیوانہ ہوئی

جاتی ہیں ۔ "آہاہا، اِدھر دیکھنا کیسا دلفریب سین

ہے'۔ 'اہو ہو! اُدھر دیکھو، کتنا پیارا نظارہ ہے'۔

ایشیائیوں میں اگر کوئی حُسنِ قدرت کا مزا لینے کی

قابلیت رکھتا ہو یا پیدا کر بھی لے تو یہ جوش

کہاں سے لائے گا! یاں تو حُسن چُپ لگا دیتا ہے

اور اس کا رُعب مہر بہ لب کر دیتا ہے۔"

اب تحریر میں طنز و ظرافت ملاحظہ ہو۔ اِسی مضمون

میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

" مشکل یہ کہ باغ و راغ کا نظارہ بھی ممکن نہ تھا۔
اور تو کچھ نہ ہو سکا "سٹیشن شماری" جاری رہی۔ اگلے
وقتوں کے لوگ انتظار میں "اختر شماری" کیا کرتے
تھے۔ اب وہ ترکیب پرانی ہو گئی۔ ریل کے سفر میں
رات کے وقت سٹیشن گننا نئے زمانے کی ایجاد ہے۔
سچ ہے ہر زمانے کی ضرورتیں جدا ہیں۔ اور ایجاد
ضرورت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے، یا جیسا انگریزی
والے کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔" چنانچہ
ریل کے سفر میں بے تاب طبیعتوں کے واسطے انتظار
کی مشکل گھڑیاں آسان کرنے کے لئے "سٹیشن شماری"
ایجاد ہوئی۔ اگر کسی نے تجربہ نہ کیا ہو تو میں سفارش
کرتا ہوں کہ یہ نسخہ آزمانے کے قابل ہے۔ اختر
شماری سے کم دلچسپ نہیں۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر ایک جگہ طنز و مزاح
کی پھلجھڑیاں اس طرح بکھیرتے ہیں :۔

"آفتاب کی تیز چمک نے خبر دی کہ اٹلی کی تاریخی سرزمین شروع ہوئی ۔ اسٹیشنوں کے ناموں نے اس خبر کی تصدیق کر دی ۔ لوگانو ، کیاسو ، کامو، جس نام کو پڑھو "واؤ" پر ختم ہوتا ہے ۔ ایک مشہور مقام کا نام ہے میلانو اور ایک قابلِ دید گرجا کو ڈومو کہتے ہیں"

دو دیباچے

کتاب کے تعارف کے لئے عموماً دیباچے لکھے جاتے ہیں۔ دیباچہ لکھنے والوں کے پیشِ نظر کتاب کے علاوہ مصنّف کی ذات بھی ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دیباچہ نگار حضرات مسوّدہ دیکھ کر کتاب کے بارے میں تو بہت کچھ لکھ جاتے ہیں۔ مگر مصنّف کو یکسر نظرانداز کر جاتے ہیں۔ یا محض مصنّف کے تعارف پر ہی سارا زورِ قلم ختم کر دیتے ہیں۔ یا پھر کتاب سے چند ایک حوالے دے کر دیباچہ مکمّل کر دیتے ہیں۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ دیباچے میں دونوں چیزیں اس طرح نمایاں ہوں کہ کتاب مصنّف کے بغیر اور مصنّف

کتاب کے بغیر دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نظر آئیں ۔ اِس سلسلے میں شیخ صاحب کا انداز خاصہ مختلف اور منفرد تھا۔ اُن کے پیشِ نظر کتاب کے ساتھ مصنّف کا تذکرہ بھی ضروری تھا ۔ چنانچہ آپ نے جس قدر بھی دیباچے تحریر کئے اُن میں خاص طور پر مصنّف کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا اور اس کے متعلّق قارئین کو زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائیں ۔ تاکہ پڑھنے والے نہ صرف کتاب سے محظوظ ہوں بلکہ ساتھ ہی ساتھ مصنّف کی علمی استعداد، ذہنی نشو و نما اور فنّی اہلیت کو جان سکیں اور اگر ہو سکے تو اِس جیسا فکر پیدا کر سکیں ۔

شیخ صاحب نے اپنی زندگی میں بعض قابلِ ذکر کتابوں کے دیباچے لکھے ۔ مثلاً سر اقبالؒ (مرحوم) کے اُردو مجموعے "بانگِ درا" کا دیباچہ ۔ حفیظؔ جالندھری کے "شاہنامہ" کا دیباچہ، تلوک چند محرومؔ کے "دیوان" کا دیباچہ، منشی سکھدیو سنہا بسملؔ الہ آبادی کے "دیوان" کا دیباچہ،

اور حکیم نذیر احمد کیف (غیرت قادری) کی کتاب کا دیباچہ یہاں ہم صرف علامہ اقبالؒ کی کتاب "بانگ درا" اور حفیظ جالندھری کے "شاہنامۂ اسلام" کے دیباچوں کا ذکر کریں گے۔

اُردو شعر و ادب میں اِن ہر دو کتب کو جو شہرت، عظمت اور مقبولیت حاصل ہے اِس کا اندازہ اِس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک یہ کتابیں ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہو چکی ہیں۔ اور کروڑوں شائقین سے خراجِ تحسین وصول کر چکی اور کر رہی ہیں۔ اور اِس میں شک نہیں کہ جس محنت و کاوش سے مصنّفین نے اِن کتابوں کو لکھا، سر عبدالقادر نے اُسی انداز سے اُن کا دیباچہ لکھ کر اُن کو چار چاند لگا دیئے۔ مثلاً "بانگ درا" کے دیباچہ سے اقتباس ملاحظہ ہو:۔

(مصنّف کے بارے میں) "جب شیخ محمد اقبالؒ کے

والد اور اُن کی پیاری ماں اُن کا نام تجویز کر رہے ہوں گے تو قبولِ دُعا کا وقت ہوگا کہ اُن کا دِیا ہوُا نام (اقبال) اپنے پُورے معنوں میں صحیح ثابت ہوُا۔"

اور :-

"ابتدائی مشق کے دِنوں کو چھوڑ کر اقبالؒ کا اُردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے اُنہیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔ اِس بزم میں اُن کو اُن کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اور اُنہوں نے کہہ سُن کر ایک غزل بھی اُن سے پڑھوائی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبالؒ سے واقف نہ تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی۔ سادہ سے الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی۔ مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی۔"

(کتاب کے بارے میں) "یہ دعوٰے سے کہا جا

سکتا ہے کہ اُردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو۔ اور اِس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں۔ اور کیوں نہ ہو، ایک صدی کے چہارم حصّہ کے مطالعہ اور تجربہ اور مشاہدہ کا نچوڑ اور سَیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ ایسا ہے کہ اِس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔"

حفیظ جالندھری کے "شاہنامۂ اسلام" سے اقتباس ملاحظہ ہو:۔

(مصنّف کے بارے میں) "اکثر شعراء نے اِس قسم کے بڑے کام بڑھاپے میں اپنے ذمّے لئے ہیں۔ حفیظ کے جاننے والوں میں جن حضرات کی نظر سے اُن کی وہ نظم گزری ہے جس کا عنوان ہے " ابھی تو مَیں جوان ہوں" اُنہیں شاید حفیظ کی شاعری کو اِس شانِ بزرگی اور تقدیس میں دیکھ کر تعجّب ہو کہ اُن

کی طبعِ رسا برائی کے اتنے زینے ایک ہی جست
میں کیونکر طے کر گئی ہے ۔ مگر جو شخص اُن کے
تخیّل کی پرواز سے آگاہ ہے ۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ
یہ جست اُن کے لئے دشوار نہ تھی ۔"
ایک اَور جگہ لکھتے ہیں کہ :-
"ابوالاثر نے جس دن نظم کی بنسری بجائی ہے،
اُس بنسری سے طرح طرح کے راگ نکلتے ہیں اور
نظموں کے اِس مطبوعہ مجموعے میں جس کا نام "نغمہ زار"
ہے اور بعض غیر مطبوعہ نظموں میں جو اس کے بعد
لکھی گئی ہیں ، اُس نے اپنی وسیع ہمدردی اور سچّی
قدرتی شاعری کے میلان سے کہیں کرشن کے گُن
گائے ہیں اور کہیں پریت کے گیت سنائے ہیں۔
مگر اُس نے تھوڑے عرصے میں محسوس کر لیا کہ اثر
کے لحاظ سے جو بات پیغمبرِ اسلام کی زندگی کے واقعات
میں ہے ، وہ کسی دوسرے انسان کی زندگی میں

نہیں پائی جاتی۔"

اور :-

"لاہور میں ایک بڑا مشاعرہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی کرسیوں پر چند کہنہ مشق شاعر متمکن ہیں اور اُن میں ایک نوعمر دُبلا پتلا سا شخص بہت سادہ لباس پہنے ہوئے بیٹھا ہے؛ جو ہر قابلِ داد شعر پر داد دیتا ہے۔ اور یوں اُس کے دِل کی کیفیت ایک خاص طرزِ اظہار رکھتی ہے۔ یعنی شعر سُنتے ہی وہ ہمہ تن داد بن کر اپنی جگہ سے اُٹھنے کو ہوتا ہے اور دایاں ہاتھ پھیلا کر اور انگشتِ شہادت شاعر کی طرف اُٹھا کر کہتا ہے "کیسا بلند شعر ہے"۔ تھوڑی دیر بعد حفیظ صاحب کی باری آئی۔ نظم لَے سے پڑھی گئی اور جلسے پر ایک بے خودی سی چھا گئی۔ اور اب ہندوستان سے دکن تک لوگوں کے کان آشنا ہو چکے ہیں۔"

(کتاب کے بارے میں) "شاہنامۂ اسلام ایک ایسی
تصنیف ہے کہ وُہ محض شاعری سے تعلّق نہیں رکھتی
وُہ اسلام کی منظوم تاریخ ہوگی۔ وہ اخلاقِ اسلام کی تعلیم
کے لئے ایک درسی کتاب کا کام دے گی۔ وُہ مصنّف
کے جذباتِ مذہبی کی ایک دِلکش تصویر ہے جو لفظوں
سے کھینچی گئی ہے۔ مَیں خوش ہوں کہ یہ سعادت میرے
حصّے میں آئی کہ ایسی کتاب کی پہلی جلد کا دیباچہ
لکھوں جو نہ صرف ادبی خوبیوں سے دیرپا معلوم
ہوتی ہے بلکہ مذہبی اَور اخلاقی پہلو سے بھی مسلمانوں
کی آئندہ نسلوں کے لئے چراغِ ہدایت کا کام
دے گی۔"

اِن اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ اِن کے لِکھے
ہوئے دیباچے کِس قدر مکمّل اور جامع ہیں۔ اِن میں
کِسی بھی پہلو سے تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کتاب
اور مصنّف دونوں کو سامنے رکھ کر دیباچے لکھے ہیں اَور

خوب لکھے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں ہر مصنّف کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اُس کی کتاب پر دیباچہ شیخ صاحب ہی لکھیں۔ چاہے اُس کے لئے اُنھیں کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔

شیخ صاحب کے تحریر کردہ دیباچے نہ صرف ادبی لحاظ سے بلند مرتبہ ہیں بلکہ صنفِ دیباچہ نگاری میں بھی ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔

حصارِ اُردو کے معمار

شیخ صاحب کو اُردو زبان سے والہانہ محبت تھی اور ہر حال میں اس کو فروغ دینے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ انگریزی زبان میں بھی آپ کو کافی دسترس حاصل تھی۔ لیکن اُردو زبان کو فروغ دینے کے لئے تو وہ ایک مشنری کی طرح کام کرتے تھے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں ہی ایسی انجمنیں قائم کیں جہاں اس وقت کے ادباء اور شعراء کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملے۔

بعد کی زندگی میں آپ اعلٰے سے اعلٰے عہدوں پر فائز ہوئے۔ مگر اُردو کی خدمت کا دامن کبھی ہاتھ

سے نہ چھوڑا۔ آپ کو اُردو زبان، اُردو کے ہر ادیب اور شاعر سے بے پناہ محبّت تھی۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اِس محبّت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔

آج سے پچاس برس پہلے کے حالات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت جو لوگ انگریزی زبان سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے وُہ اُردو زبان کو جاننا اور سمجھنا کسرِ شان خیال کرتے تھے۔ آپ نے انگریزی زبان کی حیثیت کو کم نہ سمجھا بلکہ اس میں بھی امتیازی حیثیت حاصل کی۔ اور اپنی زندگی کا آغاز ایک انگریزی جریدے "آبزرور" سے کیا —— لیکن اس انگریزی ماحول میں ہوتے ہوئے بھی اُردو کی محبّت میں کمی نہ آئی اور چار پانچ سال انگریزی اخبار میں کام کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں آپ نے اُردو کا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا۔ اِس رسالے کے اجرا کے بارے میں شیخ صاحب خود لکھتے ہیں :-

"مخزن کے اجرا کا خیال مجھے اُردو کی حمایت
کے ایک بڑے تاریخی جلسے میں بیٹھے ہوئے آیا۔
جو مدّت ہوئی لکھنؤ میں ہُوا تھا۔ اُن دِنوں اُردو
کی مخالفت جو صوبجاتِ متّحدہ میں پنڈت مدن
موہن مالوی نے شروع کی تھی، اس کا فائدہ اُٹھا کر
ایک برطانوی لیفٹیننٹ گورنر سر انٹنی میکڈانل نے پہلے
ایک ضربِ کاری اُردو کے جسم پر لگائی اور ہندی
کو اس کی جگہ دینی چاہی۔ مسلمانوں میں اس پر
بہت اضطراب پیدا ہُوا اور اُردو کے بچانے کے
لئے لکھنؤ میں ایک اہم جلسہ طلب کیا گیا جس کی
صدارت نواب محسن الملک مرحوم نے کی۔ میں اور
میر نیرنگ اور مرزا اعجاز حسین مرحوم پنجاب سے
جا کر اِس جلسے میں شریک ہوئے...... مگر ہمیں
جاتے ہی معلوم ہُوا کہ اودھ کی حکومت ہم تینوں کی
حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی رکھ رہی ہے

میکڈانل صاحب کا مزاج ان دنوں سخت برہم تھا۔ اور وہ مسلمانوں کے بہت مخالف ہو گئے تھے۔ انہیں تعجب تھا کہ پنجاب کے تین آدمی لکھنؤ کے جلسے میں شرکت کے لئے کیوں آئے۔ میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا مجھے اس جلسے میں موقع ملا۔ لاٹ صاحب کے استعجاب کا جواب یہ دیا کہ اُردو کا مسئلہ صرف صوبجات متحدہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ سارے مُلک کے اُن حصّوں سے متعلق ہے جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور ہم مجروح اُردو کی پکار سُن کر آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہر جگہ اُردو کے لئے ایک دعوتِ جنگ ہے۔ اِس جلسے میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لکھنؤ جیسے شہر میں جس میں اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے اور جہاں اُردو کے کئی شاعر اور نثرنگار ہندوؤں میں بھی موجود ہیں، وہاں صرف ایک دو ہندو شریک

جلسے تھے۔ ان میں ایک بنارس کا بوڑھا وکیل تھا اس نے اتنی ہمت کی کہ وہ جلسے میں شریک بھی ہوا اور بعض تجاویز کی بحث میں بھی حصّہ لیا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس کی وجہ وہ دباؤ تھا جو ہندی کے حامیوں اور حکومت کے کارکنوں نے مل کر ان ہندوؤں پر ڈالا ہوگا، جو دوسری صورت میں کم از کم جلسہ دیکھنے کو تو آتے۔ لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُن کی کم توجہی میں کچھ قصور مسلمانوں کا بھی ہے۔ بہت سے مسلمان شعراء نے اپنے اشعار میں تعلّی کا اظہار کرتے ہوئے ایسے شعر لکھے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ زبان کے اصلی مالک یا اجارہ دار وہی ہیں اور دوسرے لوگ بھی اگر کچھ بولتے یا لکھتے ہیں تو ان سے مستعار لیتے ہیں۔ اس سے کئی اُردو لکھنے والے ہندو اُردو سے علیحدگی اختیار کرنے لگے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے

جو مذہبی یا سیاسی بحثوں سے (جو اکثر جھگڑے کا سبب بنتی ہیں) الگ رہ کر صرف ادبی خدمات تک اپنی مساعی کو محدود رکھے اور ہندو مضمون نگاروں کو شرکتِ کار کے لئے صلائے عام دے۔ اور اس طرح اپنے ناظرین میں بھی ہندو مسلمان دونوں کو شامل کرنے کی کوشش کرے۔"

چنانچہ عملی طور پر آپ ہمیشہ سیاسیات سے الگ تھلگ رہے اور ایک دفعہ 'مخزن' میں لکھا بھی کہ سیاسیات کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن اگر میں نے ضرورت سمجھی تو اس کے لئے کوئی الگ رسالہ جاری کروں گا۔ "مخزن" کو میں سیاسیات سے الگ رکھ کر سب کا رسالہ بنانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ لندن جانے سے پیشتر اپنے ایک مخلص دوست مولوی حبیب الرحمان صاحب کو 'مخزن' میں مضامین کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"۔۔۔۔ ہاں سب حضرات کو اس امر کی تاکید کیجیے کہ

مضامین عام دلچسپی کے تلاش کریں۔ خالص اسلامی رنگ "مخزن" میں بدقّت کھپتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ نہیں کھپتا۔ اور اس کی اس پالیسی سے یہ فائدہ ہو رہا ہے کہ ہندو صاحبان کی ایک معقول تعداد اس کے ناظرین میں رہتے اور اس طرح اُردو سے کچھ دلچسپی رکھتی ہے۔ مَیں انشاءاللہ آپ کو ولایت سے خط لکھتا رہوں گا۔"

"مخزن" کے اجرا کے چوتھے ہی سال آپ انگلستان بیرسٹری کے لئے روانہ ہو گئے۔ آپ روانگی سے پیشتر مخزن کے اجرا کا باقاعدہ انتظام کر کے گئے۔ خود بھی لکھتے رہے اور احباب کو بھی لکھنے کے لئے اُکساتے رہے۔ چنانچہ مولوی حبیب الرحمان صاحب کو لندن سے لکھتے ہیں:-

"۔۔۔ اس خط کے لکھنے سے رسید منظور نہیں۔ یہ آپ کو پہلے ہی سے معلوم ہے۔ دو مطلب ہیں۔ ایک سلسلہ خط و کتابت جاری کرنا۔ آپ ضرور اوقات

فرصت میں مجھے یاد فرمایا کیجئے۔ آپ کے خطوط سے
مشرف ہونا مسرت خاص کا باعث ہوگا۔ اور جواب
لکھنے میں مجھے راحت ملے گی۔ دوسرے میری غیرحاضری
میں "مخزن" کی طرف خاص طور پر توجہ فرمانے اور مستقل
قلمی امداد دینے کا جو وعدہ آپ نے گزشتہ اگست میں
فرمایا تھا اس کی تجدید۔"

"مخزن" اردو زبان کی تاریخ میں روشنی کا درخشاں
باب ہے۔ مخزن کے اجرا نے اس وقت کے مضمون
نگاروں اور شاعروں کے لئے مواقع پیدا کئے۔ پہلے تو
وہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن اب ذوق
طلب ہوئی اور کئی گمنام جوہر منظرِ عام پر آنے لگے۔
شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ مخزن ہی کے ذریعے روشناس ہوئے
مولانا حالیؔ، مولانا شبلیؔ، حسرت موہانی، تلوک چند محروم،
پنڈت برجموہن دتاتریہ، حضرت نیرنگ، نادر کاکوروی،
مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، آزاد عظیم آبادی،

شادؔ عظیم آبادی، سید اکبر حسین اکبرؔ الٰہ آبادی، حافظ محمود شیرانی، علامہ راشد الخیری، داغؔ دہلوی، سجاد حسین یلدرم، خوشی محمد ناظرؔ، مولانا ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم، مولانا ابوالکلام آزاد اور سینکڑوں دوسرے حضرات کے مضامینِ نظم و نثر مخزن میں چھپتے رہے۔ اِن میں بیشتر تو محض "مخزن" کی بدولت روشناس ہوئے اور بعض حضرات نے فقط مخزن ہی کے لئے لکھا۔ مخزن سچ مچ ہندو مسلمان اور نئے ادیبوں کا سنگم تھا۔

شیخ صاحب نے خود بھی زیادہ تر اسی زمانہ میں لکھا۔ جب آپ مخزن کے مدیر تھے۔ آپ بعد میں بھی لکھتے رہے۔ لیکن ان کی نثر نگاری کے شباب کا زمانہ وہی تھا۔ جب آپ مخزن سے منسلک تھے مخزن سے تمام لگاؤ اصل میں اُردو سے عشق کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ جب آپ بیرسٹر ہو کر انگلستان سے لوٹے تو آپ نے دہلی میں وکالت کا سلسلہ شروع

کیا اور ساتھ ہی مخزن کا اجرا لاہور کی بجائے دہلی
سے ہونے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ مرکز میں ہوتے
ہوئے وہ اُردو زبان کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔
۱۹۴۸ء میں جب مخزن کے دَور سوم کا آغاز
ہوا تو شیخ صاحب نے اس موقع پر لکھا:

"اب ایک عرصے سے "مخزن" بند تھا۔ جب دَورِ
سوم کے آغاز کا خیال متذکرہ احباب کو آیا۔
میری دُعا ہے کہ یہ نئی کوشش کامیاب ہو اور
اُردو کی ترقّی اور استحکام کو اس سے مدد پہنچے۔ جو
حضرات اس کی عنانِ ادارت سنبھالیں گے، اگر وُہ یہ
کوشش کریں گے کہ "مخزن" کی روح ان کے قبضے
میں آ جائے تو اُن کی کامیابی انشاءاللہ یقینی ہو گی۔
اور مخزن کی رُوح تھی، دوستی اور محبّت کے ذریعہ
لوگوں کو اُردو کی رغبت دلانا اور ان میں اُردو کا
شوق پیدا کرنا۔"

یورپ کی ایک نئی زبان " اسپرانٹو " کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" ہماری ' اسپرانٹو ' وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اُردو ، کوئی ہندی اور کوئی ہندوستانی زبان کہتا ہے ہم نام کے پابند نہیں ہیں کام سے کام ہے۔ جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو اس نام سے اسے یاد کرے۔ مگر اس کوشش میں رہے کہ چار دانگ عالم میں ہندوستان کی اس خداداد اسپرانٹو کا چرچا ہو جائے۔ اُردو کو مَیں خداداد " اسپرانٹو " اس لئے کہتا ہوں کہ اپنی یورپین بہن کی طرح یہ ایک تازہ انسانی ایجاد نہیں ہے بلکہ صدیوں میں ان قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی ہے جن سے دُنیا بھر کی زبانیں پیدا ہوئیں اور بڑھی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فضیلت ہے جو ہماری " اسپرانٹو " کو یورپ کی " اسپرانٹو " پر حاصل ہے۔ ۔ ۔ "

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔

" اُردو کا عام رواج پا جانا سب کی آسانی کا باعث ہے ۔ اور بغیر غیر معمولی تردّد کے ممکن ہے کہ لوگ اس طرف مائل ہوں ۔ یورپ جس کے لئے ایک زبان " اسپرانٹو " پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے دس بارہ مختلف دُوَل کا مجموعہ ہے جہاں ہر حکومت میں زبان جُدا ، طرزِ حکومت جُدا اور قانون جُدا ہے۔ ایک حکومت کے باشندوں کی اغراض اکثر دوسری حکومت کے باشندوں کی اغراض کے خلاف ہیں اور ایک سلطنت اور دوسری سلطنت میں رقابت موجود ہے ۔ مگر ان لوگوں کی وسعتِ خیال اور روشنیٔ دماغ دیکھئے کہ ایسے بڑے اختلافات کو بھی مٹانے یا ان کے دبانے کے لئے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور ہماری کوتاہ اندیشی کو دیکھئے کہ ایک مُلک ، ایک حکومت اور مشترکہ

ضروریات اور اغراض کے باوجود فکرِ ہم زبانی سے غافل ہیں ۔ حالانکہ ہمارے راستے میں وہ مشکلات نہیں جو اُن کے راستے میں ہیں ؟"

آپ کو اُردو زبان سے اِس قدر عشق تھا کہ بانگِ درا کے دیباچے میں کتاب کے محاسن بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔

"گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے

مطلب یہ کہ جس احساس نے شاعر سے یہ شعر کہلوایا وہ اس سے کام لے کر اب پھر کچھ عرصہ کے لئے گیسوئے اُردو کو سنوارنے کی طرف متوجہ ہو ؟"

اُردو پر شیخ صاحب کے جس قدر احسانات ہیں اُن کا کہاں تک تذکرہ کیا جائے ۔ آپ جس عہدہ پر بھی فائز رہے حتیّ الامکان اُردو کی خدمت کرتے رہے ۔ ۱۹۴۵ء میں جب ریٹائر ہوئے تو آپ نے

کوئی نئی ذمہ داری نہ سنبھالی ۔ لیکن اُردو کی مجالس میں حاضری اکثر دیتے رہے ۔ سالہا سال لاہور میں بزموں اور مشاعروں میں شرکت کرتے رہے ۔ اکثر و بیشتر مشاعرے شیخ صاحب کی صدارت ہی میں ہوتے تھے ۔ اس صدی کا کوئی ایسا شاعر یا ادیب نہیں ہے جسے کسی نہ کسی حیثیت سے شیخ صاحب سے واسطہ نہ پڑا ہو ۔ یہ اُردو ہی کا عشق تھا کہ اپنی رحلت سے صرف ایک سال پیشتر جب پنجاب یونیورسٹی نے ایم ۔ اے اُردو کی کلاسیں شروع کیں تو آپ نے اعزازی پروفیسری قبول کر لی اور پیرانہ سالی کے باوجود باقاعدہ لکچر دیتے رہے اور رحلت سے کچھ عرصہ پیشتر ایک نئے جریدہ "اوراقِ نو" کے لئے اپنے پیغام میں لکھتے ہیں :-

"ہر چند کہ میری صحت کچھ عرصہ سے اچھی نہیں ، میں حتی الوسع اپنے دوستوں کے ساتھ اس خدمت میں شریک رہوں گا۔"

بلاشبہ شیخ صاحب مرحوم قصرِ اُردو کے ایک ایسے
معمار تھے جنہوں نے خشتِ اوّل سے لے کر بامِ
آخرین تک اسے اپنے عشق اور دلی لگاؤ سے سجایا۔
اور آج اِس ایوان میں جتنی بھی بزم آرائیاں نظر
آتی ہیں، یہ اُنہی کے عزم و خلوص کا نتیجہ ہیں۔

ایک مُصلح کی حیثیت سے

شیخ صاحب آزادی کے دِلدادہ تھے - آپ نے طرح طرح کے مضامین لکھ کر مُلک کو بیدار کرنے کی کوشش کی - آپ میدانِ سیاست کے نبرد آزما تو نہ تھے - لیکن اپنے وطن اور ہم وطنوں کو بہت عزیز جانتے تھے اور ہمیشہ اُنہیں اُبھارنے کی کوشش کرتے رہتے تھے - اُن کے مضامین میں سے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں -

آزادی کے عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"آزادی ضرور حاصل کرو - مگر ایسے ذرائع سے جو خود آزادی کی بیخ کنی کرنے والے نہ ہوں - آزادی

لوگر دیانت داری اور وضعداری کو ہاتھ سے نہ دو۔ کیونکہ یہ آزادی کے جوہر ہیں۔ آزادی مجموعہ ہے افراد کے دل و دماغ کی آزادی کا۔ پس کوئی ایسا کام نہ کرو جو دل و دماغ کی آزادی کے بیج کو پنپنے سے روکے ان احتیاطوں اور شرائط کے ساتھ اگر میدانِ آزادی میں قدم رکھو تو بہت سے آپ کے دلی ہوا خواہ شوق سے صدا لگائیں گے کہ "ہاں بڑھے چلو"۔

ایک اور جگہ "حریت اور آزادی" میں فرماتے ہیں۔

"عزت وہی ہے جو وطن کی عزت کے ساتھ ہو۔ اور وطن کی عزت اہلِ وطن میں حریت پیدا ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہ جب ہی پیدا ہوگی کہ ہر ہمدردِ وطن اسے اپنی عزت، اپنی آبرو، اپنے نفع سے بڑھ کر عزیز رکھے"۔

"خدمتِ قوم کے طریقے" میں فرماتے ہیں:۔

"جو شخص اپنے کتب خانہ میں بیٹھ کر مدت العمر

میں ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جس کے مطالعے
سے ہزاروں افرادِ قوم مستفید ہوتے ہیں، جس سے
مُلک کے ذخیرۂ لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہوتا
ہے اور جس سے کسی غیر مُلک یا قوم کے پڑھنے
والے کی نظر میں مصنّف کی قوم کی نسبت اچھی
رائے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہماری رائے میں وُہ
شخص باوجود گوشہ نشین ہونے کے اور باوجود اپنی
سادگیٔ وضع کے ایک سچّا خادمِ قوم یا دُوسرے
لفظوں میں محسنِ قوم ہے، جس کی خدمت کا شُکریہ
کافی طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک عہدہ دارِ
سرکاری جو اپنا فرضِ منصبی دیانت، محنت اور
لیاقت سے ادا کرتا ہے۔ خاصکر اِس نیّت سے
کہ اُس کی قوم کی نسبت گورنمنٹ کی رائے اچھی
ہو، اور آئندہ اُس کے ہم قوموں کو زیادہ سہولتیں
اور زیادہ ترقیاں ملیں یا اپنے ادائے فرائض میں

اپنی قوم کے افراد کو جائز فائدے پہنچانے کی
طرف مائل رہتا ہے، مُلک و قوم کے دِلی شُکریہ کا
مُستحق ہے، اور اُس کا نام خادمانِ قوم کی معزز فہرست
میں درج ہونا چاہیے۔ علیٰ ہٰذا القیاس وُہ تاجر جو کوئی
نیا صیغہ تجارت کا ڈھونڈ نکالتا ہے اور اِس سے
آپ بھی فائدہ اُٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی
فائدہ پہنچاتا ہے، مُلک کی ایک اعلےٰ خدمت کر
رہا ہے۔ ایک شخص کسی دُوسرے مُلک میں جاکر
اقامت اختیار کرتا ہے، اِس اِرادے سے کہ
وہاں جو اُس کے ابنائے وطن جائیں اُن کی خدمت
کرے اور اپنی نیکی اور خُوبی سے اُنہیں فائدہ
پہنچائے، مُلک کی خدمت میں مصروف ہے۔ گو
مُلک سے باہر ہے اور گو اکثر اہلِ مُلک اُس کی
خدمت سے ناواقف ہیں۔ کئی لوگ ہیں کہ عام
جلسوں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خانگی طور پر گھر

گھر گھر جا کر اپنے ہمسائیوں اور دوستوں کو امورِ
خانہ داری میں ، تربیتِ اطفال کے متعلق یا تعلیم
کے متعلق مشورہ اور امداد دیتے رہتے ہیں یا اُن
میں پڑھنے لکھنے کا شوق پھیلاتے ہیں یا اُنہیں
کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں
کہ وہ حقیقت میں زیادہ خدمت کر رہے ہیں بہت
سے اُن لوگوں کی نسبت جن کی تقریروں سے
مجالسِ قومی کے ہال گونج رہے ہیں اور جن کے
کارناموں کے تذکروں سے اخبارات پُر ہیں ۔ وہ
اخبار نویس جو ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائضِ اخبار نویسی
انجام دیتا ہے اور جن کا مُدعا یہ ہے کہ مُلک میں
واقفیتِ عامہ ترقی کرے ، اہلِ مُلک روشن خیال ہو
جائیں اور واقعاتِ عالم پر اُن کی نظر وسیع ہو مُلک
کے سچے بہی خواہوں اور خدامِ وطن میں شمار ہونے
کے لائق ہے ۔ خواہ کسی عام جلسہ میں ایک مرتبہ

بھی لب کشا نہ ہُوا ہوگا"

تصنّع، بناوٹ اور نام نہاد وضعداری آج ہمارے
لئے ایک وبالِ جان بن گئی ہے۔ معاشرے کا ہر
فرد خوش پوشی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ پر اپنی آمدنی
کا ایک معقول حصّہ خرچ کرتا ہے اور دیگر ضروریاتِ
زندگی کو کسی حد تک کم یا ختم کرنے پر مجبور ہے۔ یہ
صحیح ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ انسان بدلتا ہے۔
اُس کے خیالات و نظریات بدلتے ہیں اور حالات
و واقعات بدلتے ہیں۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ
اُن کے ساتھ ساتھ انسان اپنی اصلیت بھی کھو دے
اور اپنے اُوپر تصنّع اور بناوٹ کا دبیز غلاف چڑھا
لے اور سادگی سے یکسر منحرف ہو جائے۔ اِس
گمراہ کُن بلکہ تباہ کُن نظریہ کے خلاف " بناوٹ اور
سادگی" کے عنوان سے آپ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

"جو نسبت کھوٹے کو کھرے سے ہے وہی تناسب

بناوٹ اور سادگی میں ہے، اِس پر بھی ایک عالم بناوٹ پر مِٹا ہوُا نظر آتا ہے۔ کیونکہ بہت تھوڑی آنکھیں ہیں جن کو وُہ بینائی عطا ہوئی ہے جو بناوٹ کے پردوں کو ہٹا کر ہر چیز کے حسن و قبح کو اُس کی عُریانی میں دیکھ سکے۔

جو لوگ سادگی کے نظاروں سے آشنا ہیں، وُہ بناوٹ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے مگر بناوٹ کے شیدائی بھی کیا کریں۔ اِس دُنیا میں رہ کر دُنیا سے الگ رہنا بھی تو ہر کسی کا کام نہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ایک ادنیٰ نمونہ اِس بڑی مثال کا دِکھا رہے ہیں جو دُنیا نے اُن کے لئے قائم کی ہے . . . . .

پس جب یہ دُنیا بذاتِ خود ایک بڑا دامِ تزویر ہے۔ جو اِس عالم پر پھیلا ہوُا ہے، تو وُہ لوگ جو اِس بڑے دام کے نیچے چھوٹی چھوٹی

جالیاں لگاتے ہیں، معذور ہیں۔ اور جو بیچارے
نادانستہ جھوٹے پھندوں میں پھنسے ہیں وہ معذور تر
ہیں۔ اِس میں کوئی کلام نہیں کہ بناوٹ کا پھندا
بڑا زبردست پھندا ہے۔ جسے دیکھو اِس کا شکار
ہے۔ عُشاق ہیں تو زُلفوں کے پیچ و خم کے پھیر
میں، شعراء ہیں تو کلام میں تلازم کی تلاش میں،
واعظ ہیں تو ناز و کرشمہ بر سرِ منبر کے انداز
سوچ رہے ہیں۔ مضمون نگار ہیں تو اُنہیں قافیہ
بندی کی دُھن لگی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ
جن کی زُلفِ پُر پیچ کے دیوانے ہیں وُہ اِس قابل
بھی ہے کہ اُسے چاہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ جس
کلام کو تلازم کے نمک مرچ سے لطیف بنا رہے
ہیں، وُہ بھی کسی ذاتی صفت سے متصف ہے یا
نہیں۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ وعظ میں نکات بھی
دلپذیر ہیں۔ یا محض انداز ہی کی فکر ہے۔ اور کوئی

نہیں پرواہ کرتا کہ قافیہ بندی کی دُھن میں کہیں
اصلِ مضمون ہی خراب نہ ہو جائے۔"

شیخ صاحب کتنی عظیم باتیں فرما گئے ہیں! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا مُصلح، کوئی عظیم مفکر یا دینی فلاسفر دُنیا اور دُنیا والوں کو صراطِ مستقیم دِکھا رہا ہو۔ اِن باتوں میں کتنی عظمت، کتنی رفعت اور پاکیزگی ہے۔ بے شک ایک سچّے اور دیانتدار مُصلح کی باتیں اِتنی ہی پُرتاثیر اور خیال انگیز ہوتی ہیں کہ انسان کا دِل و دماغ بے اختیاری اور لاشعوری طور پر اُن پر ایمان لانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

خراجِ عقیدت

جب ۹ر فروری ۱۹۵۰ء کو ملّتِ اسلامیہ کے اِس بطلِ جلیل کا آفتاب زندگی موت کی تاریک وادی میں اُترا تو ادب و آئین کی دُنیا میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔

اِس حادثۂ جانکاہ پر جہاں مُلک بھر کے نامور ادیبوں اور قانون دانوں نے شیخ عبدالقادر کی موت پر اظہار رنج و ملال کیا، وہاں نہایت پُرجوش الفاظ میں انہیں خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ ذیل میں چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:۔

"پنجاب کے بزرگ شیخ عبدالقادر کی المناک رحلت

کی خبر سن کر مجھے بہت صدمہ ہوا - ان کی متانت ہمہ گیر تھی - محض اپنی قابلیت کے بل بوتے پر اُنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی - ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر اُن کے اُٹھ جانے کا غم سب سے زیادہ اُردو ادب کے پرستاروں کو ہوگا اُردو ادب کی اُنھوں نے بڑی قابلِ قدر اور رضاکارانہ خدمت کی تھی"

(گورنر پنجاب سردار عبدالرّب نشتر)

"شیخ عبدالقادر بلاشبہ صُوبے کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے تھے - آنے والی نسلیں انھیں مُدّتوں یاد رکھیں گی - بار کے کمرے میں جب وہ آتے تھے تو حاضرین میں بہت سے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے اور اُن کی جادُو جگانے والی اور

دل موہ لینے والی باتیں سُنتے تھے جس میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوتی تھی اور گہرے سوچ بچار کی جھلکیاں بھی۔ وُہ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے پنجاب کے مسلمانوں کو ڈاکٹر اقبالؒ، سر فضل حسین، سر محمد شفیع اور سر شہاب الدّین جیسی شخصیتوں کو جنم دیا۔ ایک ایک کر کے وُہ سب رخصت ہو گئے۔ اب سر عبدالقادر کی وفات کے ساتھ ساتھ عظیم شخصیتوں کا یہ پُورا جھُرمٹ ماضی کے دھندلکوں میں گُم ہو گیا ہے"۔

(چیف جسٹس مسٹر محمد منیر)

"سر عبدالقادر کی موت سے اِس مُلک کے قانون کے پیشہ اور پبلک زندگی کو بہت بڑا دھکّا لگا ہے"۔

(چیف جسٹس فیڈرل کورٹ مسٹر عبدالرشید)

"سر عبد القادر کے گزر جانے سے ملّت میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے، اسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسیات سے قطع نظر ایک بڑا کام جو اُنہیں زندۂ جاوید رکھے گا وہ اُردو زبان کی خدمت ہے"۔

(مولانا ظفر علی خان)

"سر عبد القادر کی وفات سے اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے وہ حقیقت میں اُردو کی گزشتہ پچاس سال کی جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ پنجاب میں اُردو کی مقبولیت کا سہرا درحقیقت اُنہی کے سر ہے"۔

(سیّد عابد علی عابد)

اِس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ادبِ اُردو

کی موجودہ حوصلہ افزا رفتار میں سر عبدالقادر مرحوم و مغفور کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس لئے کہ وُہی تھے جنہوں نے مغربی تعلیم یافتہ طبقے میں اُردو ادب کا ذوق پیدا کیا اور اپنی پُرکشش شخصیت اور اپنے مشہور رسالہ "مخزن" کے ذریعے سے صدہا ادباء و شعراء پیدا کر دیئے۔ زبانِ اُردو اُن کے بے شمار احسانات کے تشکّر سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ ان کے انتقال سے ایک ایسی ہستی اُٹھ گئی ہے جو مشرق و مغرب کی بہترین خوبیوں کی جامع تھی ؂

(مولانا عبدالمجید سالک)

شیخ عبدالقادر صاحب کی وفات کے باعث ایک عظیم الشان بزرگ کا سایہ پاکستانیوں کے سروں سے اُٹھ گیا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں مسلمانوں کی

تعلیمی اور عملی جد و جہد میں اُنہوں نے ہمیشہ
ایک قابلِ قدر حصّہ لیا۔ ان کی دلچسپیاں ہمہ گیر
تھیں۔ اسی وجہ سے شاید ہی کوئی انجمن یا جلسہ
ایسا ہو جس کی انہوں نے وقتاً فوقتاً صدارت نہ
کی ہو۔ جن بزرگوں نے پنجاب میں لوگوں کے
اندر اُردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کیا اُن میں شیخ
صاحب کا نام صفِ اوّل میں آتا ہے۔ وُہ علامہ
اقبالؒ کے ہمنشین اور عُمر بھر کے ساتھی تھے۔ علامہ
اُن کی بہت عزّت کرتے تھے۔ علاّمہ اقبالؒ کی
طبیعت کا یہ خاص انداز سب کو معلوم تھا کہ وُہ
کبھی کِسی کے کہنے پر اپنا کلام نہیں سناتے تھے
لیکن مَیں نے خود دیکھا ہے کہ جب بھی شیخ صاحب
اُن سے ملنے کے لئے آئے۔ تو علاّمہ نے خود بخود
چند اشعار اُن کو سُنا دِیئے۔ وُہ اِنہیں حقیقی سخن
فہم سمجھتے تھے ؟

(خلیفہ عبدالحکیم)

"شیخ عبدالقادر مرحوم قدیم مشرقی تہذیب کا زندہ مجسمہ تھے۔ ان کی شرافت، وضعداری، زندہ دلی اور بزرگانہ شفقت ملنے والے کو مسحور کر لیتی تھی۔ وہ ایک متین ماہرِ صحافت، مخلص دوست تھے"۔

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم)

تاریخ عبدالقادر بیرسٹر کو یاد نہیں رکھے گی، عبدالقادر چیف جج اور عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل بھی یاد سے محو ہو جائے گا، لیکن "عبدالقادر مدیرِ مخزن" کا نام اُردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ درخشندہ رہے گا۔ وہ عبدالقادر جس کا رسالہ ہندو، مسلمان، نئے پُرانے ادیبوں کا سنگم بنا رہا"۔

(حامد علی خاں)

شیخ صاحب مرحوم کی صحبتوں کا ذکر کرنے کے لیے شاید مجھے اپنی عمر کی تمام و کمال فرصت درکار

ہو۔ میں نے اپنی عمر میں ان سے بہتر مجلسی آدمی
نہیں دیکھا۔ میری ان سے جب ملاقات ہوئی۔ تو
اُس وقت تک وہ مضمون نگاری تقریباً تقریباً ختم
کر چکے تھے۔ لیکن مجھے اکثر یہ احساس ہوتا کہ یہ
مردِ بزرگ ایک چلتی پھرتی ایسی زندہ لائبریری ہے
جو ہر مجلس میں ہر سامع کے مذاق کے مطابق جاندار
روایات کی بارش برساتی رہتی ہے ؟؟

(ڈاکٹر محمد باقر)

"۔ ۔ ۔ ۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد میں نے
ایسی بے تکلفی محسوس کی جو عام طور پر ہم عمروں
میں ہوا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی موجودگی
میں اپنی اور اُن کی عمر کا تعیّن کرنا مشکل ہو
جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ نصف صدی کی وُہ طویل
مُدّت جو ہم دونوں میں حائل ہے سمٹ کر ایک

لہجے میں آ گئی ہے۔ دراصل یہ شیخ صاحب کی شفقت کی انتہا تھی۔ وہ بیک وقت ایک شفیق بزرگ اور بے تکلّف دوست تھے۔ اُن کا یہ سلوک صرف مجھ تک ہی محدود نہ تھا۔"

(حفیظ ہوشیارپوری)

"۔۔۔ عبدالقادر کا نام زندہ رہے گا جب تک پاکستان زندہ ہے۔ عبدالقادر کا نام زندہ رہے گا جب تک اُردو زبان زندہ ہے۔ عبدالقادر کا نام زندہ رہے گا جب تک علم و ادب کی محفلیں زندہ ہیں۔ دُنیا ان کو ادیب کی حیثیت سے یاد کرے گی۔ اُردو زبان کا سب سے بڑا مُحسن جس کے ہاتھوں میں اُردو کے ہزاروں ادیب پلتے رہے۔ شاعر ہونا تو قدرت کا عطیہ ہے مگر شاعر گر ہونا انسان کی فطرتِ جمیل کی محنت کا نتیجہ

ہے۔ شیخ صاحب ادیب تو تھے مگر وہ ادب نواز تھے جن کی ہر جنبشِ قلم متوازن اور صحیح ادب کا راستہ دکھاتی تھی !!

(ڈاکٹر محمد شجاع ناموس)

"ہوا کے دوش پر یہ خبر فضا میں پھیل گئی کہ سر عبدالقادر آج صبح ۶ بجے وفات پا گئے۔ فوراً زبان پر اناللہ و انا الیہ راجعون آ گیا۔ ذہن میں خیالات اُبھرنے لگے۔ کانوں میں ایک مانوس آواز آنے لگی۔ یہ آواز جلسوں میں، محفلوں میں اور اسی ہوا کے دوش پر بارہا کانوں تک پہنچی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آ گیا۔ نورانی چہرہ، سفید ریش، ترکی ٹوپی۔ لب ہلے ___ یہ لب جب بھی ہلتے رہے ہمیشہ علم و حکمت کے موتی برساتے رہے۔ اور اب یہ ماننا پڑے گا کہ یہ لب ہمیشہ

کے لئے خاموش ہو گئے۔ اب محفلیں اس مانوس آواز سے محروم ہو گئی ہیں۔ یہ چہرہ چھپ گیا ہے۔ شیخ عبدالقادر فوت ہو گئے ـــــ تاریخ کا ایک اور باب ختم ہو گیا۔ سرسیّد کے زمانے اور زمانہ حال کی درمیانی کڑی ٹوٹ گئی۔ حالی، نذیر احمد کا ساتھی ان سے جا ملا۔ اقبالؒ کا دوست جُدا ہو گیا۔ اُردو کا محسن چلا گیا۔ اور اب ہم میں اُس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔"

(شیر محمد اختر)

"شیخ صاحب قبلہ مسلمانوں کے اس علم دوست طبقے سے تعلّق رکھتے تھے، جنہوں نے ہر ممکن دائرۂ عمل میں خدمتِ قوم کا فرض انجام دیا۔ موت کے بے رحم ہاتھ نے جہاں ملّت سے ایک محبِ صادق چھین لیا، وہاں مجھے بھی ایک مشفق دوست،

اور مخلص رہنما سے محروم کر دیا۔ . . . مشورہ و امداد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتا تھا۔ جب کبھی ایسی ضرورت پیش آئی۔ میں ہمیشہ اُن کی شرافت، وضعداری، بزرگانہ محبّت اور دِلی ہمدردی سے متأثر ہوا۔ ہزاروں اور لوگوں کی طرح اُن کی شفقت کی یاد میرے دِل میں بھی تا دمِ آخر رہے گی۔"

(خلیفہ شجاع الدین مرحوم اسپیکر پنجاب اسمبلی)

"شیخ عبدالقادر کے جاننے والوں پر ہمیشہ سے یہ روشن رہا کہ وُہ لیڈری کے حریص نہ تھے۔ ورنہ اِس قدر کند ذہن نہ تھے کہ یہ نہ سمجھتے ہوں کہ لیڈری کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ انسان کوئی بڑا چندہ جمع کر کے اخباروں کے ذریعہ نام آور بنے۔ اُنہیں اِس پُرانے مقولہ سے یعنی:۔

زر خرچ کُن تا میر شوی   چوں میر شوی زر بسیار

سے بے انتہا نفرت تھی۔ اُنھوں نے اِس مقولے کے ماننے والوں کو بڑھتے دیکھا اور نوکِ پاپوش سے اِس زر دوزی عروج کو ٹھکرا دیا"

(فلک پیما مرحوم)

"مَیں نے شیخ صاحب کو خلوت و جلوت میں بارہا دیکھا۔ گھر میں دیکھا، دفتر میں دیکھا۔ صدارت کرتے دیکھا۔ بچّوں سے گفتگو کرتے دیکھا۔ دیس میں دیکھا۔ پردیس میں دیکھا۔ اُنہیں جس حالت میں دیکھا ایک ہی طرح کا پایا۔

چلّا کے بات نہیں کرتے تھے مگر ہر جگہ سُنے جاتے تھے۔ اکڑفوں نہیں تھی مگر رعب قائم تھا۔ شفقت کرتے تھے اور عقیدت کا مرکز تھے۔ ان کی محفل ایک دربارِ عام تھا۔ یہاں سے ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق متمتع ہوتا تھا۔

اُن کی گفتگو کا ایک مخصوص لہجہ تھا۔ ان کی زندگی کی ایک خاص روش تھی۔ جیسے نتھری ہوئی جھیل کی سطح پر نسیم سحرگاہی پرافشاں ہو۔ بہت آندھیاں آئیں۔ بہت طوفان اُمڈے۔ مگر اُن کا توازن برہم نہ ہوا۔

اُن کی موت بھی ایک لہر کی طرح آئی۔ اُنہیں دُنیوی زندگی سے جاودانی زندگی کے کنارے پر بہا کر لے گئی۔ یہ حادثہ نہیں واقعہ تھا۔ میر تقی کا ایک شعر اُنہیں بہت پسند تھا۔ اُن کے حسب حال ہے ؎

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

جب ہم دُوسری دُنیا میں پہنچیں گے تو وہ ہمیں مسکراتے ہوئے ملیں گے۔ جیسے کوئی ایک ہی گھر میں ایک کمرے سے اُٹھ کر دُوسرے کمرے

میں گیا ہو۔ میں جب لاہور سے لندن گیا تو
وہاں بھی اسی طرح ملے تھے۔ اب کیوں نہ اسی
طرح ملیں گے!
اُن کی شخصیت موت سے نہیں بدل سکتی!"
(ڈاکٹر تاثیر مرحوم)

قطعۂ تاریخِ وفات

اسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں
وہ تھا قلب و دماغِ شہرِ لاہور
ہُوا بے تاج "فرقِ انجمن" جب
کہا مَیں نے "چراغِ شہرِ لاہور"

۱۹۵۱ — ۱ — ۱۹۵۰

حفیظؔ ہوشیار پوری

خوشگوار باتیں

{ذیل کا مضمون حامد علی خان، ڈاکٹر محمد باقر اور حفیظ ہوشیار پوری
کے خیالات کا مرہونِ منت ہے۔}

زندگی کے ٹھوس حقائق اور ادب کی عظیم اقدار سے شناسا سر عبدالقادر جہاں سنجیدگی، متانت اور تبحرِ علمی کا ایک پاکیزہ پیکر تھے، وہاں وہ احباب کی محفلوں میں اپنی گفتگو سے مہکاریں بھی لٹاتے پائے جاتے تھے۔ اُن کی زندگی کا یہ پہلو نہ تو اُن کے مضامین سے نمایاں ہوتا ہے، نہ اُن کے سوانح نگاروں نے اسے اپنا موضوع بنایا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اُن کا قُرب اور شرفِ ہم نشینی میسّر آیا ہے وہ اِس

چلتی پھرتی لائبریری کی باغ و بہار شخصیت کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے ایسے حضرات کو شیخ صاحب مرحوم کی زندگی کے اِس قہقہہ بار پہلو پر ضرور روشنی ڈالنی چاہیئے۔ تاکہ اُن کے عقیدت مند اُن کی اِس مخفی قوّت سے بھی شناسا ہو جائیں۔ اِس سلسلے میں شیخ صاحب مرحوم کی جو چند خوشبودار یادیں ہمیں ہاتھ لگی ہیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

جن دنوں شیخ صاحب بیرسٹری کی سند لے کر انگلستان سے واپس وطن تشریف لائے تھے اور آپ نے لائل پور میں وکالت شروع کی تھی، اُن کے احباب میں ایک ہندو وکیل بھی شامل تھا۔ جسے اُردو فارسی سے گہرا لگاؤ تھا۔ فرصت کے لمحات میں بار روم میں خاصی گہما گہمی رہتی تھی۔ ایک دِن اِن صاحب نے تجویز پیش کی کہ بار روم میں یونہی وقت

ضائع کرنے کی بجائے کوئی مفید کام کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ شیخ صاحب کل سے "دیوانِ حافظ" لیتے آئیں۔ تاکہ اس کے مطالعہ سے فرصت کا مصرف نکالا جائے۔

اگلے روز شیخ صاحب نے دیوان حافظ لاکر بار روم میں میز پر رکھ دیا۔ ایک صاحب نے کتاب اٹھائی، تو انہی ہندو وکیل صاحب نے دیکھتے ہی کہا: "لو جی غضب ہو گیا، ہم سمجھتے تھے دیوان حافظ پنجابی میں ہو گا، مگر یہ تو فارسی میں ہے۔ یہ ایرانی بھی حافظ ہوتے ہیں؟"

یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ نیشنل وار فرنٹ کے زیرِ اہتمام ہر طرف میلے ٹھیلے ہو رہے تھے۔ انہی دنوں بہاولپور میں ایک "آل انڈیا مشاعرہ" ترتیب پایا۔ علامہ سیماب، مولانا ظفر علی خان، خوشی محمد

ناظر اور حفیظ جالندھری کے علاوہ تمام ملک سے سربرآوردہ شعراء کو اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اور اِن شاعروں کو صادق ایجرٹن کالج بغداد الجدید کے ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ لوگ شاعروں کو دیکھنے کے لیے ہوسٹل کے صحن میں آتے، ایک ایک کمرے میں جھانک جھانک کر دیکھتے اور آپس میں کانا پھوسی کر کے ہنستے ہوئے آگے گزر جاتے۔ شعراء حضرات اُن کی اس تانک جھانک پر سخت جھلاتے مگر اس کا علاج ان کے بس میں نہ تھا۔

شام کو مشاعرے کے پنڈال میں شیخ سر عبدالقادر بھی، جو اس وقت بہاولپور میں چیف جسٹس تھے، مہمان شاعروں کے درمیان تشریف لائے اور ہر ایک سے پوچھا۔ "کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" اس موقعہ پر علامہ سیماب نے کہا: "شیخ صاحب! اور تو کوئی

تکلیف نہیں ہوئی ، البتہ جب ہوسٹل میں لوگ آ کر ایک ایک کمرے میں جھانکتے ، اشارے کرتے اور ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں تو ہمیں اپنی حالت پر بڑا غصّہ آتا ہے ـــــ"

شیخ صاحب نے یہ سُنا تو کھلکھلا کر ہنس پڑے اور فرمایا ـــــ" معلوم ہوتا ہے بہاولپور والوں نے شاعروں کو چڑیا گھر کا "مال" سمجھا ہے اور وہ یہ دیکھنے آتے ہیں کہ بھالو کس کمرے میں ہے ، بندر ، زیبرا ، شیر ، چیتا اور ہاتھی کہاں کہاں بند ہیں ـــــ"

اور شیخ صاحب کے اِس تبصرہ پر ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی ۔

مخزن کے سہ بارہ اجراء کے لئے شیخ صاحب ایک مضمون لکھ رہے تھے ۔ یہ مضمون کچھ لمبا ہو

گیا۔ ایڈیٹر نے کم کرنے کے لئے کہا۔ اِس پر
شیخ صاحب نے یہ لطیفہ سُنایا :-

" رڈیارڈ کپلنگ جن کا ایک ایک لفظ انگلستان
میں سونے سے تُلتا تھا، کِسی زمانے میں "سول
اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر تھے۔ اِن دِنوں ایک
سِیدھے سادے بُوڑھے منشی فضل دین پریس میں
فورمین تھے۔ مُنشی صاحب کے ہاتھ میں ہر وقت
ایک فٹ رولر رہتا تھا اور وُہ جب کبھی مسٹر
کپلنگ کے کمرے میں داخل ہوتے تو وُہ فٹ
رولر پر کہیں اپنا انگوٹھا رکھ کر اور رولر اُوپر
اُٹھا کر مسٹر کپلنگ سے کہتے :-

"Sahib! Your articke so [illegible]ch."

مطلب یہ کہ آپ کا مضمون اِتنا لمبا ہو گیا ہے،
اِسے مختصر کر دیں۔ اِس پر مسٹر کپلنگ اُٹھتے اور
مضمون کو پُورا کر دیتے"۔

خطوط کے نمونے

4 Jany

Lah

11 - 12 - 4

عزیزم شیخ جاوید صاحب۔

السلام علیکم۔ میں نے کتاب کا دیباچہ مجوزہ لکھ دیا ہے۔ اس کا
مسودہ آپ کو بھیجتا ہوں۔ لفافہ سے جدا ہے دیکھئے۔ اگر
ہو سکتا تو مضمون پروف مجھے دکھا لیں۔ تاکہ کوئی لفظی غلطی نہ رہ جائے
سرورق میں کچھ تبدیلی مناسب سمجھی ہے اور
اس کی وجہ دیباچہ میں لکھ دی ہے۔ امید ہے آپ بھی
اس تبدیلی سے اتفاق کریں گے۔

والسلام

مخلص

عبدالقادر

شیخ صاحب اور تاریخیں

سال	واقعہ
۱۸۷۴ء	پیدائش بمقام لدھیانہ
۱۸۹۰ء	انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ وظیفہ حاصل کیا۔
۱۸۹۴ء	بی۔اے کی ڈگری حاصل کی (فرسٹ ڈویژن)
۱۸۹۵ء	اسسٹنٹ ایڈیٹر "پنجاب آبزرور" (انگریزی)
۱۸۹۸ء	ایڈیٹر "پنجاب آبزرور"
۱۹۰۱ء	اجرا رسالہ "مخزن" لاہور
۱۹۰۴ء	بیرسٹری کے لئے انگلستان کو روانگی
۱۹۰۷ء	لندن سے واپسی (آپ نے دہلی میں پریکٹس شروع کی۔ اور مخزن جو آپ کی غیر حاضری میں بھی باقاعدہ نکل رہا تھا، اب دہلی سے نکلنے لگا۔)
۱۹۰۹ء	واپسی لاہور ـــ پریکٹس
۱۹۱۱ء	لائل پور میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے ۸ سال رہے۔

۱۹۲۱ء	جج ہائی کورٹ لاہور
۱۹۲۲ء	ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل
۱۹۲۴ء	صدر پنجاب لیجسلیٹو کونسل
۱۹۲۵ء	وزیر تعلیم
۱۹۲۶ء	لیگ آف نیشنز کے اجلاس میں شرکت کے لئے جنیوا گئے۔
۱۹۲۷ء	قائم مقام ریونیو ممبر اور سر کا خطاب
۱۹۲۹ء	مرکزی پبلک سروس کمیشن میں رکن
۱۹۳۰ء	لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج
۱۹۳۴ء	وزیر ہند مقیم لندن کی کونسل کے ممبر (۵ سال لندن رہے اور ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ کے شروع ہونے سے پیشتر وطن لوٹے)
۱۹۳۹ء	ممبر وائسرائے ایگزیکٹو کونسل
۱۹۴۲ء	چیف جسٹس بہاولپور
۱۹۴۵ء	بہاولپور سے واپسی پر لاہور میں قیام
۱۹۴۸ء	اجراد مخزن — دورِ سوئم
۹ فروری ۱۹۵۰ء	رحلت

لندن جانے کے ئے۔ اور بچوں کو سا تھ لے جانے کے کرایہ کے لئے۔ کافی رہے

پاس ملس تھے۔ شیخ صاحب نے مجھے اپنی زبان سے کہا تھا زمین کا ایک ٹکڑا گروی رکھا تھا۔ اس کو بیچ کر جی نے کرایہ کا ذریعہ ادا کیا

T. S. [illegible]
3rd November 1974